اللہ

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کیلئے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت (یعنی معرفت حاصل) کریں

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ

کتابچہ نمبر 14

شاہراہِ معرفت

اکابر بالخصوص مجددین رحمۃ اللہ علیہم کی تعلیمات کے تعارف کیلئے

حضرت سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم

مسترشد حضرت مولانا محمد اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ

و خلیفہ مجاز دیگر اکابر رحمۃ اللہ علیہم

ناشر : خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ راولپنڈی

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے علومِ شریعت، طریقت اور حقیقت (معرفت) سے کتابچوں کا سلسلہ

شاہراہِ معرفت

کتابچہ نمبر 14

(ذیقعدہ۔1444ھ (بمطابق خیبر۔ 1401، شمسی ہجری)

بمطابق) مئی۔جون۔2023ء)

زیرِ سرپرستی

حضرت شیخ سید شبیر احمد کاکاخیل صاحب مدظلہٗ العالی

مقصد: اسلاف کی تحقیقات سے اُمَّت کو آجکل کی

سمجھ میں آنے والی زبان میں روشناس کرنا

مجلس تحقیقات

زین العابدین صاحب مدظلہٗ

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ

مکان نمبر CB-1991/1 ۔ بلمقابل جامع مسجد سیدنا امیر حمزہ

گلی نمبر4۔اشرف لین نزد آشیانہ چوک۔اللہ آباد ۔ویسٹرج 3 ۔راولپنڈی

فہرستِ مضامین		
نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
1	دیباچہ	2
2	حمدِ باری تعالیٰ	4
3	نعتِ رسولِ اکرم ﷺ	6
4	عارفانہ کلام	7
5	مطالعہ سیرت بصورتِ سوال	8
6	جمعہ بیان	13
7	تعلیماتِ مجدّدِیہ	33
8	مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ	86
9	توضیح المعارف (تیسری قسط)	114
10	خانقاہ کے شب و روز	124

دیباچہ

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے کہ ہر ماہ خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ سے کتابچہ شاہرائے معرفت شائع کیا جاتا ہے، جس میں اکابرین کی تعلیمات کا نچوڑ عام فہم انداز میں عوام تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

لہٰذا اِسی سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے شاہرائے معرفت کا چودھواں شمارہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش ہے۔ سابقہ شماروں کی ترتیب کو برقرار رکھتے ہوئے اس شمارے کی ابتدا بھی حمد اور نعت شریف سے کی گئی ہے اس کے بعد حج کی مناسبت سے ایک عارفانہ کلام شامل کیا گیا ہے۔

اس شمارے میں جو نثری مضامین شامل کیے گئے ہیں، ان میں پہلا مضمون "مطالعۂ سیرت" کے عنوان سے ہے۔ دوسرا مضمون حضرت شیخ سید شبیر احمد کاکاخیل صاحب دامت برکاتہم کا حج کی مناسبت سے جمعہ کا بیان ہے جس میں حضرت نے تفصیل سے بتایا ہے کہ حج کی اصل روح کیا ہے اور حج کرتے وقت ہمیں کون کون سی کیفیات حاصل ہونی چاہئیں، تاکہ ہمارا حج ہمارے لیے نفع مند ثابت ہو۔

اس کے بعد حضرت شیخ سید شبیر احمد کاکاخیل صاحب دامت برکاتہم کی ایک نئی تصنیف "**توضیح المعارف**" میں سے روح کے بارے میں اکابرین کی تحقیقات کے ضمن میں روح کے اجزاء پر بات کی گئی ہے۔

اس کے بعد حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات میں سے ان مکتوبات کی تشریح کی گی ہے جن میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کے پانچ ارکان میں سے نماز کو خصوصی طور پر ذکر فرمایا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عقائد کے درست ہونے کے بعد سب سے زیادہ ضروری نماز کو صحیح طور پر ادا کرنا ہے پھر نماز کے مختلف پہلو مثلاً تعدیلِ ارکان، آداب و سنن وغیرہ کو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے کافی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات میں سے درس نمبر 11 شامل کیا گیا ہے جس میں حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سوز و گداز کے بارے میں گزشتہ سے پیوستہ بات چل رہی ہے۔

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ شمارۂ ہذا کا بغور مطالعہ فرمائیں اور اپنی کیفیات و آراء سے مطلع فرمائیں۔ اللہ کریم ہماری کامل اصلاح فرمائے اور ہمیں دائمی رضا سے نوازے۔ آمین۔

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ

vvv

حمدِ باری تعالیٰ

کمال عشق ہے اس میں کہ دیکھتے ہی رہو
جو وہ ٹھہرائے خوشی سے تو ٹھہرتے ہی رہو

ہے مہربان ہم پر اتنا کہ اس کی حد ہی نہیں
وہ جس بھی حال میں رکھے تو بس اس پہ ہی رہو

سر تسلیم خم ہو اس کے حکم پر ہر آں
سر رہے نہ رہے آگے اس کے جھکتے ہی رہو

کب کیا چاہتا ہم سے ہے کو، پانے کے لئے
اس کے محبوب کے طریقے پہ ہی چلتے ہی رہو

دل و دماغ میں کچھ اور نہ ہو وہ ہی ہو
جو وہ چاہے جیسے چاہے وہ ہی کرتے ہی رہو

جو وہ چپ رہنے کو کہہ دیں تو پھر تو ہونٹ سی لو
اور اگر کہنے کو کہہ دیں وہ تو کہتے ہی رہو

اگر وقار پہ خوش ہوں تو پر وقار بن جاؤ
جب مچلنے کا اشارہ ہو مچلتے ہی رہو

دل ترا اس کی محبت سے بھرا ہو ہر آن
جس وقت ڈرنے پہ خوش ہو تو پھر ڈرتے ہی رہو

جان ہے اس کی، اس کے واسطے ہو جینا مرنا
شبیر ہر لمحہ پھر قربان اس پہ ہوتے ہی رہو

کلام: حضرت اقدس شیخ سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم

vvv

نعت

دربارِ رسالت میں حاضری کے وقت

کیسے دل پیش کروں کیسے سلام پیش کروں
اِس بڑے در پہ کیسے اپنا کلام پیش کروں

خدا کے فضل سے آنا یہاں نصیب ہوا
کیسے یہاں اپنا عرضِ ناتمام پیش کروں

کوئی رستہ میرے دل کو یہاں یوں مل جائے
یہاں پہ ہو کے سلام یوں میں مدام پیش کروں

میرے اللہ مجھے آداب یہاں کے کر دے عطا
کہیں بھی ہوں میں اپنی صبح شام پیش کروں

دین کی خدمت کیلئے میں شبیرؔ قبول ہو جاؤں
دست بستہ عرض کروں اور اپنا نام پیش کروں

کلام: حضرت اقدس شیخ سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم

کتاب: پیغامِ محبت

عارفانہ کلام

حج کے بارے میں

عشق کا معیار حج بلند کرے، خاک نشینی بھی یہ سکھاتا ہے
اسی معیار پہ جو پورا اترے، حق سے بے شک یہی ملاتا ہے

لطفِ اعمالِ حقیقت اِن کی، جو ہے پانے سے متعلق ہے
دل کی غفلت کو اگر دور کریں، یہ حقیقت بھی یہ دکھاتا ہے

یہ تسلسل ایسے اعمال کا ہے، جس میں بس وہ ہی بس نظر میں ہو
عشقِ عشاق کے رستے سے پھر، سیدھا وہ دل میں اپنے آتا ہے

مزدلفہ، منیٰ، عرفات سب میں، اُس کے پانے کی جستجو میں رہو
تری جھوٹی عقل کو توڑ دے یہ، عقل سچی کی طرف یہ لاتا ہے

یہ سمندر ہے ایک عشق کا شبیر، کوئی پوچھے تو یہ بتا دینا
اس کا محبوب بنے گا جو بھی، خوب غوطے اس میں لگاتا ہے

کلام: حضرت اقدس شیخ سید شبیر احمد کاکاخیل دامت برکاتہم

کتاب: نورِ معرفت

مطالعہ سیرت بصورتِ سوال

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ

اَمَّا بَعْدُ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سوال:

حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب سیرت النبی ﷺ کے حصہ چہارم میں صفحہ نمبر 83 پر فرماتے ہیں: آپ ﷺ نے بھی دیگر انبیاء کرام کی طرح بار بار فرمایا بلکہ وحی الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہ کہہ دو کہ میں تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی اور بشر ہوں۔ یہ اعلان در حقیقت اس غلط عقیدہ کو مٹانے کے لئے تھا جو انبیاء کی شانِ الوہیت کے متعلق عیسائیوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اس نبی کی اُمت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے جو دنیا میں خدا کی توحیدِ کامل کا مبلغ بن کر آیا تھا۔ دوسری طرف اس اعلان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ پیغمبر اور عام انسانوں میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کو عام انسانوں پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے اِلّا یہ کہ پیغمبروں کو وحی آتی رہتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں۔ گویا اس کا منشاء یہ ہے کہ پیغمبر میں صرف اس لمحہ اور آن میں منصب نبوت کا امتیاز پایا جاتا ہے، جب اس پر وحی نازل ہوتی ہے اور اس سے پہلے اور اس کے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے۔ اس سے بڑھ کر ایک اور مختصر فرقہ نے یہ دعوی کیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحی قرآنی کی صورت میں آیا

اس کے علاوہ آپ کے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں وہ صرف حاکمانہ اور انتظامی امور ہیں، جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہے اور نہ اسلام کا جُز ہے۔ یہ خیالات حقیقت میں دوسرے فرقہ کے مفرطانہ کے مقابلے میں تفریطانہ ہیں اور یہ دونوں اعتدال کی حد سے باہر ہیں اور حقیقت ان کے بیچ میں ہے۔

یہاں حضرت نے جن دو گروہوں کا فرمایا ہے ان کے خیالات اور نظریات آج کل میڈیا پر کافی پھیلائے جارہے ہیں اور خصوصاً نوجوانوں کو دوسری قسم کے نظریات والے لوگ گمراہ کررہے ہیں۔ اس سے بچنے کے لئے انبیاء کرام کا مقام اور دوسرے انسانوں پر ان کی فضیلت واضح فرمائیں۔

جواب:

یہ تو بہت بڑا مضمون ہے، ظاہر ہے اس کو چند الفاظ میں جمع کرنا تو ناممکن ہے جیسے حضرت نے فرمایا ہے میرا خیال ہے کہ وہ اس موضوع کا ایک بہترین نچوڑ ہے۔ باقی تو اس کو جتنا پھیلایا جائے وہ ایک علیحدہ بات ہے۔ البتہ آج کل جس طریقے سے وہ لوگ کرتے ہیں اس کام (project) پہ ہماری نظر ہونی چاہیے کیونکہ یہ لوگ پینترے بدلتے ہیں، مختلف طریقوں سے سامنے آتے ہیں۔ لہٰذا یہ موضوع کہ آپ ﷺ کون ہیں؟ اس بارے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آپ ﷺ رسول ہیں، پھر آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں۔ اب یہ خاتم النبین والا جو منصب ہے تو اگر آپ ﷺ پر کسی وقت وحی آرہی ہے یا کسی وقت نہیں آرہی تو اس وقت یہ رتبہ (status) ان سے واپس تو نہیں ہوتا۔ جیسے بادشاہ جس وقت کھانا کھا رہا ہوتا ہے اس وقت بھی بادشاہ ہوتا ہے۔ جس وقت سو رہا ہوتا ہے اس وقت بھی بادشاہ ہوتا ہے۔ جس وقت لوگوں

سے مل رہا ہوتا ہے، اس وقت بھی بادشاہ ہوتا ہے۔ جس وقت خلوت میں ہوتا ہے اس وقت بھی بادشاہ ہوتا ہے۔ اس کی بادشاہی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی طریقے سے آپ ﷺ کا جو مقام خاتم النبیین ہونے کا ہے یہ اصل میں آپ ﷺ کا وہ مقام ہے جس تک دنیا کا کوئی انسان نہیں پہنچ سکتا۔ ہمارے شیخ مولانا اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: ''ولی را ولی می شناسد، نبی را نبی می شناسد، خاتم النبین را خدا می شناسد''۔ یعنی ولی کو ولی جانتا ہے۔ نبی کو نبی جانتا ہے اور خاتم النبیین کو صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسرا خاتم النبیین ہے ہی نہیں جو ان جیسا ہو اور ان کی طرح ادراک کر سکے۔ تو چونکہ آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں۔ اس لئے ان کی مکمل معرفت صرف اللہ پاک ہی کو حاصل ہے کسی اور کو نہیں۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ آپ ﷺ کے پاس جو وحی آتی تھی وہ دو قسم کی ہے ایک وحی وہ ہے جو وحی متلو قرار پائی ہے یعنی قرآن اور ایک وہ وحی ہے جو وحی غیر متلو ہے اس کا ثبوت بھی وحی متلو میں موجود ہے۔ کیونکہ قرآن پاک میں ہے کہ آپ ﷺ نہیں کچھ کہتے مگر وہ جو ان کو وحی کی جاتی ہے۔ ''کچھ کہتے ہیں'' میں سب کا احاطہ ہو گیا کہ جو بھی کہتے ہیں اس وحی کے لحاظ سے ہے۔ اس وجہ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ ﷺ کی باقی باتیں بھی آپ ﷺ کی نبوت سے ناشی ہیں اور جن کو صرف دنیا کے انتظامی نقطۂ نظر سے کہا گیا تھا ان کے لئے باقاعدہ خصوصی طور پر فرمایا گیا:

''أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ'' (مسلم، حدیث: 6277)

ترجمہ: ''تم اپنے دنیا کے کام کو اچھی طرح جانتے ہو''۔

چنانچہ دنیا کے کاموں کو اس سے علیحدہ کر لیا گیا ہے اور جو دین کے کام ہیں اور جس درجہ کے بھی انتظامات ہیں جو آپ ﷺ نے کئے ہیں وہ سب کے سب ہمارے لئے نمونہ ہیں۔

اس وجہ سے دین کی ہر بات کا بنیادی اصل قرآن اور سنت ہے، قرآن وحی متلو ہے اور سنت وحی غیر متلو ہے۔ لہٰذا یہ دونوں چیزیں چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ذریعے سے بھیجی ہیں لہٰذا جتنا جتنا تعلق آپ ﷺ کے ساتھ مضبوط ہو گا قرآن کے ساتھ بھی اتنا ہی تعلق مضبوط ہو گا اور وحی غیر متلو کے ساتھ بھی اتنا تعلق مضبوط ہو گا۔ وحی غیر متلو یعنی آپ ﷺ کی اتباع اللہ پاک نے وحی متلو میں بتادی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

(قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ) (آل عمران: 31)

ترجمہ: "اے میرے حبیب اپنی امت سے کہہ دیں اگر تم اللہ کے ساتھ محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کر لو۔ اللہ پاک تم سے محبت کرنے لگیں گے"۔

اور یہ اتباع شخصیت کی ہوتی ہے کتاب کی نہیں ہوتی۔ کتاب پر تو عمل ہوتا ہے۔ اب جس شخصیت کی اتباع کا قرآن نے حکم دیا ہے تو یہ اتباع دائمی اتباع ہے۔ یہ نہیں کہ کسی ایک چیز میں ہے دوسری میں نہیں ہے۔ آپ ﷺ کی پوری سیرت میں اتباع ہے۔ نماز کے بارے میں فرمایا: **"صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ" (سنن دار قطنی، حدیث نمبر: 2)** حج کے بارے میں فرمایا کہ اگلے سال شاید میں آپ میں نہ رہوں، لہٰذا مجھ سے حج کے مسئلے اچھی طرح سیکھ لو۔ اس طرح روزے کے بارے میں، صدقہ زکوٰۃ کے بارے میں، معاملات کے بارے میں، الغرض تمام چیزوں کے بارے میں آپ ﷺ نے احکام ارشاد فرمائے تھے۔

اس سلسلے میں ایک قانونی اور گُر کی بات میں عرض کرتا ہوں کہ آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا **"مَآ اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِيْ" (ترمذی، حدیث: 2641)** کہ جس طریقے پر میں چل

رہا ہوں جس پر جس پر میرے صحابہ چلیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں آپ ﷺ کی سنت پر چلنا چاہیے یہ **"مَآ اَنَا عَلَيۡهِ"** ہے۔ **"وَاَصۡحَابِيۡ"** کا مطلب ہے کہ آپ ﷺ کی اس سنت پر چلنے کا طریقہ صحابہ سے سیکھنا چاہیے یعنی سنت کو اپنانے کا طریقہ صحابہ سے لینا چاہیے۔ لیکن بنیاد تو سنت ہے۔ اس وجہ سے قرآن اور سنت بنیاد ہیں۔ صحابہ کرام کے طریقے Case studies ہیں اور فقہاء کی فقاہت اس کی وضاحت کرتی ہے۔ صوفیاء اس پر عمل کرواتے ہیں۔ اس لئے ہر گروہ کی اپنی اپنی افادیت ہے۔ جو لوگ ان چیزوں کو نہیں مانتے وہ اصل میں انسان کو اس کی اصل اور حقیقت سے علیحدہ (detached) کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک دوسری بات ہے کہ عیسائیت کی طرح اللہ جل شانہ کی الوہی صفات میں شامل کرنا، اس کا تو خود آپ ﷺ نے رد فرمایا ہے۔ لہٰذا اس میں بھی **"مَآ اَنَا عَلَيۡهِ وَاَصۡحَابِيۡ"** پر عمل ہو گا کہ آپ ﷺ نے خود اپنے بارے میں کیا فرمایا اور آپ ﷺ کے بارے میں قرآن میں اللہ نے کیا فرمایا اور آپ ﷺ کے بارے میں صحابہ کرام نے کیا سمجھا۔ بس ان تینوں سے ہم صحیح صورتِ حال معلوم کر سکتے ہیں۔ باقی لوگوں کے اپنے خیالات ہیں۔ ان کے خیالات کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

وَاٰخِرُ دَعۡوٰنَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ

جمعہ بیان

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ﴾ (البقرۃ: 165)

وَقَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ: اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَہٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَہٗ ھَوَاھَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰہِ (سنن ترمذی: 2459)

وَقَالَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ: اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَۃً اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّہٗ اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ (مشکوۃ: 2762)

وَقَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی ﴿اَلْحَجُّ اَشْھُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِیْھِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ﴾ (البقرۃ: 197)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ وَ صَدَقَ رَسُوْلُہُ النَّبِیُّ الْکَرِیْمُ

معزز خواتین و حضرات !

حج کی ادائیگی کے سلسلے میں داخلے شروع ہو چکے ہیں اور حج کی وزارت حجاج کے لئے حج پر جانے کے پروگرام بنا رہی ہے۔ حج تک جتنے ایام باقی ہیں ان میں حج کے بارے میں بات ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اعمال معرکۃُ الآرا ہوتے ہیں۔ اُن میں بہت فوائد و ثمرات ملتے ہیں لیکن صرف لاعلمی کی وجہ سے انسان محروم ہو جاتا ہے۔ اس لئے صحیح وقت پر ان چیزوں کا جاننا بہت بڑی نعمت ہے۔ چونکہ ان ایام میں لوگ حج پہ جا رہے ہیں اس لئے حج کے بارے میں بات کرنا اُن کے لئے انتہائی مفید ہو گا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہو گا کہ جن لوگوں پہ حج فرض ہے اور ان کا حج کا پروگرام کبھی سستی کی وجہ سے، کبھی لاپرواہی کی وجہ سے یا حالات کی وجہ سے مسلسل تعطل کا شکار ہے، انہیں حج کا شوق ہو جائے گا، حج کی فکر پیدا ہو جائے گی۔ جب فکر پیدا ہو جاتی ہے اور انسان پوری کوشش کرتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ رہ جاتا ہے تو پھر معاملہ اور ہوتا ہے لیکن اگر وہ کوشش ہی نہیں کرتا تو پھر معاملہ بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس پہ حج فرض ہو اور وہ حج نہ کرے اور اس کی موت آ جائے تو اللہ جل شانہ کو اس کے بارے میں کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ یہودی مرتا ہے یا عیسائی مرتا ہے۔

لہٰذا اِن ایام میں حج کی باتیں کرنے کا ایک فائدہ تو ایسے لوگوں کے اندر شوق کو پیدا کرنا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جو لوگ حج پر جانے والے ہیں انہیں حج کے اعمال کے بارے میں آگاہ کر دیا جائے۔ ایک ضروری بات یہ بھی ہے کہ ان اعمال کے اندر جان ڈالنے والی چیز کے بارے

میں آگاہ کرنا بہت ضروری ہے۔ جیسا کہ حدیثِ احسان میں آتا ہے کہ آپ ﷺ سے پوچھا گیا: **"مَا الْاِیْمَانُ"**۔ تو آپ ﷺ نے ایمان کے شعبے بتا دیئے۔ پھر پوچھا گیا: **"مَا الْاِسْلَامُ"**۔ تو آپ ﷺ نے اسلام کے ارکان بتا دیئے۔ پھر پوچھا گیا: **"مَا الْاِحْسَانُ"**۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ" (بخاری شریف:50)

ترجمہ: "(احسان یہ ہے کہ) اللہ کی عبادت و بندگی تم اس طرح کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیوں کہ اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھتے ہو، پر وہ تو تم کو دیکھتا ہی ہے"۔

حج کے اعمال کرتے ہوئے بھی انسان کے اوپر یہ کیفیت طاری ہونی چاہئے کہ جیسے وہ خدا کو دیکھ کے عمل کر رہا ہے اور اگر اس پر یہ کیفیت طاری نہیں ہو رہی تو کم از کم قلبی طور پر یہ آگاہی ہو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔

عموماً اس حدیث شریف کے بارے میں لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کا تعلق نماز سے ہے۔ نماز میں ایسی حالت ہونی چاہئے۔ یقیناً وہ تو ہونی ہی چاہئے لیکن حج میں بھی یہی بات ملحوظ رکھی جائے۔

حج میں دورانِ طواف انسان کہتا ہے: **"لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَ النِّعْمَةَ لَكَ وَ الْمُلْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ"**۔ یہ **"لَبَّيْكَ"** حاضر کا صیغہ ہے۔ حاضر کا صیغہ اُس وقت بولا جاتا ہے جب مخاطب سامنے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اگر اِس کیفیت کے ساتھ **"لَبَّيْكَ"** کہے کہ جیسے وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، جیسے اللہ پاک سے مخاطب ہے اور یقین کے کانوں سے محسوس کر رہا ہو کہ اللہ پاک سن رہا ہے تو پھر اس کی بات ہی اور ہو گی۔ اور اگر ہم اسی حالت میں حج کریں تو یقیناً اس حج کی بات ہی اور ہو گی۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے جب حج کر لیا اور حج سے واپس آ گئے تو فرمایا: "میں نے اندھوں اور بہروں کی طرح حج نہیں کیا"۔ اس قول سے ان کا مطلب یہ تھا کہ انہیں وہ کیفیت حاصل رہی جو حج میں حاصل ہونی چاہئے۔

ایک ہوتا ہے صرف formality (رسمی کارروائی) پورا کرنا۔ یعنی مکینکل (یعنی مشینی) انداز میں اس طرح کے اعمال کر لینا جس طرح کہا گیا ہے۔ یہ بھی حج ہے لیکن وہ حج جو انسان قلب کے ساتھ کر لے، روح کے ساتھ کر لے، عقلِ ایمانی کے ساتھ کر لے، وہ حج مختلف ہے۔ سبحان اللہ! اگر انسان ایسا حج کر لیتا ہے تو وہ حج سے ایسا پاک ہو کر واپس آتا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں ہے۔ وہ اس طرح پاک و صاف شمار ہوتا ہے جیسے وہ ابھی پیدا ہوا ہے۔ ورنہ mechanical (میکانکی و مشینی) انداز میں حج کرنے سے بعض دفعہ انسان کی عقل ماؤف ہو جاتی ہے۔ اپنے غلط

جذبات کی وجہ سے اس کی عقل فیل ہو جاتی ہے اور وہ ایسی حرکات کرنے لگتا ہے جن سے بجائے فائدے کے نقصان ہو جاتا ہے۔ مثلاً حجرِ اسود کو بوسہ دینا حج کے اعمال میں سے ایک عمل ہے۔ محبت کا تقاضا ہے کہ حجرِ اسود کو بوسہ دیا جائے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والی بات ہوتی ہے۔ لیکن اگر آدمی اس عمل کے لئے ظلم کرے، کسی کو دھکا دے دے، کسی کو زخمی کرے کسی کو نقصان پہنچائے تو اس طرح حجرِ اسود کو بوسہ دینا اللہ پاک کو قبول نہیں ہے، بلکہ یہ تو اپنے اوپر حجت تمام کرنے والی بات ہے کہ یہ آدمی وہاں جا کر بھی ظلم سے باز نہیں آیا۔ وہاں جا کر بھی اس کو کسی پر رحم نہیں آیا۔ یہ وہاں جا کر بھی خود غرض ہی رہا۔

حجرِ اسود کے سامنے انسان کی جو صورت بنتی ہے، جس حالت میں انسان حجرِ اسود کے سامنے جاتا ہے، اس کے دل پر اسی حالت کی مہر لگ جاتی ہے۔ پھر وہ حالت اس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ دوبارہ حجرِ اسود کے سامنے نہیں آتا۔ اگر کوئی آدمی آخری بار حجرِ اسود کے ساتھ ظلم کی حالت میں ملتا ہے اور اس کے دل پر اس ظلم کی مہر لگ جاتی ہے تو اب یہ ظالم ہی رہے گا۔ اس لئے بعض لوگ جب حج سے واپس آتے ہیں تو ان کی حقیقت لوگوں پہ کھل جاتی ہے۔ پتا چل جاتا ہے کہ وہ حقیقت میں کیسے ہیں، ان کے اندر کیا ہے۔

ہم لوگوں کو حج سیکھنا چاہئے۔ حج سیکھنے میں دو باتوں کا استحضار ہونا چاہئے۔ ایک ہے حج کے مسائل کا سیکھنا اور دوسرا ہے حج کی روح کو سمجھنا اور اس کے مطابق حج کرنا۔ اعمال کے اندر جس چیز سے جان آتی ہے اگر وہی چیز حج کے اندر بھی ہو تب وہ حج صحیح معنوں میں حج ہوتا ہے۔

ہم نے اس سلسلہ میں ایک کتاب بھی لکھی ہے اور وہ کتاب اس مجبوری کی وجہ سے لکھی ہے کہ حج کی جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں مسائل تو بیان کئے گئے ہیں لیکن حج کی روح والا پہلو بہت کم بیان کیا گیا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فضائلِ حج میں اس کو بیان کیا ہے۔ اس کتاب کو بھی ضرور پڑھنا چاہئے۔ لیکن اس کے کچھ پہلو ایسے ہیں جو اگر سامنے نہ آئیں تو انسان حج کی روحانیت سے محروم رہ سکتا ہے۔ لہٰذا اس چیز کو سامنے لانے کے لئے ایک کتاب لکھنی پڑی جس کا نام ہے "شاہراہِ محبت"۔

حج کی روح اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی محبت پیدا کرنا ہے جو انسان کی نفسانی عقل کے اوپر ایسی غالب ہو جائے کہ وہ نفسانی عقل کام نہ کر سکے اور انسان اللہ پاک کے حکم پر عمل کے لئے ہر وقت تیار رہے۔ یہ حج کی روح ہے۔ اب یہ کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ ہر چیز مثال سے پہچانی جاتی ہے۔ تھیوری مثال کے ذریعے سمجھائی جا سکتی ہے، بغیر مثال کے اس کا سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ حج کے اندر اس کی مثالیں موجود ہیں کہ اللہ پاک کے حکم کو ہر چیز پر ترجیح کیسے دی جاتی ہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مثال، حضرت ہاجرہ علیہا السلام کی مثال، حضرت آدم علیہ السلام کی مثال۔ یہ سب مثالیں ہیں۔ ان مثالوں کو بنیاد بنا کر اعمال بنائے گئے ہیں۔ اگر میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام والا عمل تو کر لوں لیکن میرے عمل میں وہ روح نہ پیدا ہو جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے عمل میں تھی۔ اسی طرح اگر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عمل میں سے وہ روح نکال دوں، حضرت حضرت ہاجرہ علیہا السلام کے عمل میں سے اس روحانیت کو نکال دوں تو اس عمل کی کوئی حیثیت نہیں رہ جائے گی۔ حج فرض تو ادا ہو جائے گا لیکن

وہ چیز نہیں ملے گی جو اس کے اندر ملنی چاہئے تھی۔ اسی وجہ سے حج کو پوری زندگی میں ایک بار فرض کیا گیا ہے۔ صاحبِ استطاعت کے اوپر زندگی میں کم سے کم ایک بار ان چیزوں کا حاصل کرنا ضروری ہے۔

میں اس سلسلے میں پہلے کچھ بنیادی باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ دو ترتیبیں ہوتی ہیں: ایک رحمانی ترتیب ہوتی ہے اور ایک شیطانی ترتیب ہوتی ہے۔ رحمانی ترتیب میں عقل جذبات کو قابو کرتی ہے اور اس میں عقل پر شریعت حاکم ہوتی ہے۔ انسان کے اندر جذبات مختلف اعمال کے محرِّک ہیں۔ یعنی کسی چیز کو چلانے کی طاقت جذبات ہیں۔ جذبہ نہ ہو تو انسان کام نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ جذبہ کس صورت میں ہے۔ وہ جذبہ عقل کے قابو میں ہو، بے وقوفی کی بات نہ ہو، پھر وہ عقل بھی ایسی ہو جو شریعت کے قابو میں ہو۔ جو عقل شریعت کے تحت نہیں ہے وہ تو بذات خود الحاد کی طرف لے جا رہی ہے۔ لہٰذا وہ عقل جو شریعت کی تابع ہے اس عقل کے ذریعے جذبات کو کنٹرول کرنا، یہ رحمانی ترتیب ہے۔ جبکہ شیطانی ترتیب میں جذبات عقل کو متاثر کرتے ہیں اور آفاقی تعلیمات یعنی شریعت میں تاویلیں کر کے نفس کی غلط خواہشوں کا دفاع کیا جاتا ہے۔ مثلاً جذبہ یہ ہے کہ میں موسیقی سنوں، جذبہ یہ ہے کہ ناچ گانا دیکھوں۔ اب اس جذبہ کو بروئے کار لانے کے لئے تاویلیں کی جاتی ہیں کہ موسیقی جائز ہے، موسیقی روح کی غذا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب باتیں انسان کی عقلِ فاسد سے آتی ہیں۔ وہ عقل جو نفس کے تابع ہے اُدھر سے یہ باتیں آ رہی ہیں۔ جب انسان ایسی عقل کے تابع ہوتا ہے تو پھر انسان انسان نہیں رہتا، وہ اللہ پاک کا باغی بن جاتا ہے۔ وہ ایسا ہی بن جاتا ہے جیسے غیر مسلم مادر پدر آزاد معاشرہ ہوتا ہے۔ اس کی

نفسانی خواہشات عقل پر اتنی غالب ہو جاتی ہیں کہ عقل کا کام ہی صرف ان خواہشات کو پورا کرنا رہ جاتا ہے۔ حدیث شریف میں ایسے لوگوں کو بے وقوف فرمایا گیا ہے۔ حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ عقل مند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو قابو کیا اور آخرت کے لئے کام کیا۔ اور بے وقوف وہ ہے جس نے اپنے نفس کو اپنی خواہشات پورا کرنے میں لگا دیا اور پھر بھی اللہ تعالیٰ سے بغیر توبہ کئے مغفرت کی امید کرتا رہا۔ مخالفت کے باوجود مغفرت کی امید رکھنا، یہ بھی نفسانی عقل کا کام ہے۔ عقلِ فاسد سکھاتی ہے کہ جو چاہو کرلو اللہ بڑا غفور و رحیم ہے وہ معاف کر دے گا۔ یقیناً اللہ غفور و رحیم ہے لیکن اللہ پاک کا قانون بھی ہے۔ اللہ جل شانہ نے ہمارے سامنے ایک لائحۂ عمل بھی بھیجا ہے جس کو شریعت کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا مطالبہ ہے کہ اس پر عمل کرو۔ اب اگر کوئی اس پر عمل نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ اللہ غفور و رحیم ہے تو یہ شخص اللہ تعالیٰ کی صفتِ غفوریت کی بے ادبی کر رہا ہے، نتیجتاً یہ شخص اس صفت سے فائدے کے بجائے نقصان اٹھا رہا ہے۔

پس وہ عقل جو جذبات سے مغلوب ہو کر شریعت کی خلاف ورزی کا سبب بنے، فی الاصل وہ بے وقوفی ہے۔ عقل کی صورت میں اس بے وقوفی کی اصلاح بہت ضروری ہے۔ شرعی فرائض کی کچھ حکمتیں ہوتی ہیں، ان میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کے اندر اس عمل کی روح پیدا ہو جائے۔ نماز کا مقصد یہ ہے کہ انسان میں نماز کی روح پیدا ہو جائے۔ نماز کی روح عبدیت ہے۔ جب انسان نماز پڑھتا ہے تو انسان کی بندگی کا اظہار ہوتا ہے اس طور پر کہ نماز میں آپ اللہ پاک کے ہر حکم پر فوری عمل کرتے ہیں۔ رکوع میں جو کچھ پڑھنے کا بتایا گیا، وہی پڑھ سکتے

ہیں کچھ اور نہیں پڑھ سکتے۔ آپ سجدہ میں وہی پڑھ سکتے ہیں جو بتایا گیا ہے۔ اٹھتے وقت جو بتایا گیا ہے وہی پڑھ سکتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ" (مشکوٰۃ:683)

ترجمہ: "اس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھو"۔

آپ ﷺ اپنے آپ کو "عبد" بتاتے ہیں۔ **"اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ"**۔ آپ ﷺ اللہ کے خاص بندے تھے۔ جو شخص آپ ﷺ کی طرح نماز پڑھے گا وہ بھی "عبد" بن جائے گا۔ اسی عبدیت کی ٹریننگ نماز کے اندر ہو رہی ہے۔ جب انسان صحیح معنوں میں نماز پڑھتا ہے تو روز بروز اس کی بندگی پختہ ہوتی جاتی ہے۔ نماز کے اندر عبدیت ہے۔ روزہ کے اندر قوتِ بہیمیہ کی مخالفت ہے۔

کچھ چیزیں ایسی ہیں جو ہم انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ہیں، مثلاً انسان بھی کھاتا پیتا ہے حیوان بھی کھاتا پیتا ہے۔ انسان بھی سوتا ہے حیوان بھی سوتا ہے۔ انسان بھی مباشرت کرتا ہے حیوان بھی کرتا ہے۔ انسان کی یہ چیزیں حیوان کے ساتھ مشترک ہیں۔ اگر ایک انسان عقل کی پروانہ کرے شریعت کی پروانہ کرے تو اس کے اوپر حیوانیت سوار ہے۔ کیونکہ حیوانوں پر کوئی شریعت نافذ نہیں ہے۔ وہ مکلف مخلوق ہی نہیں ہیں۔ ان سے کوئی مطالبہ ہی نہیں ہے۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اپنی جبلت کے مطابق کر رہے ہیں۔ حیوانوں سے کوئی مطالبہ نہیں ہے لیکن انسانوں سے

مطالبہ ہے۔ انسان جانوروں کی طرح زندگی نہیں گزار سکتا۔ اس لئے جو انسان حقیقی معنوں میں انسان نہیں ہیں ان کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾(الاعراف:178)

ترجمہ: "یہ لوگ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں"۔

ایسے انسانوں کو "جانوروں سے بھی گئے گزرے" اس وجہ سے کہا کہ یہ جانور نہ ہوتے ہوئے بھی جانوروں جیسے کام کر رہے ہیں۔ اس لئے یہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ کیونکہ یہ مکلف مخلوق ہیں جب یہ اس قسم کی حرکت کریں گے جو جانوروں کی طرح ہو گی تو یہ بہت ہی سخت نقصان میں چلے جائیں گے۔

زکوٰۃ کی حکمت مال کی محبت کو کم کرنا ہے۔ انسان کو مال اللہ نے دیا ہوا ہے۔ اللہ اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ پورا سال گزرنے کے بعد جب نصاب پورا ہو تو اس میں سے چالیسواں حصہ مجھے دو۔ اللہ پاک کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ پاک آپ سے لے رہا ہے تو اپنے لئے نہیں بلکہ کسی اور کے لئے لے رہا ہے جو اس کا مستحق ہے۔

اگر کوئی شخص کسی کو کہے کہ مجھے چالیس ہزار روپے دے دیں، اور وہ کہے کہ ٹھیک ہے یہ چالیس ہزار لے لو سال بھر میں مجھے صرف ایک ہزار روپے دے دیا کرو باقی تم خرچ کیا کرو۔ تو کیا خیال ہے وہ آدمی خوش ہو گا یا ناخوش ہو گا۔ یقیناً خوش ہو گا۔ اسی طریقے سے اللہ پاک ہمیں

چالیس ہزار دے رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ اس میں سے ایک ہزار مجھے دے دو یعنی مستحق لوگوں کو دے دو۔ اگر کوئی اس پر عمل نہیں کر رہا تو اس کے اندر حبِّ مال ہے اور یہ محبت ہلاک کرنے والی ہے۔ اگر اس نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو یہ قیامت کے دن سانپ بن کر اس کے گلے کے گرد لپٹ جائے گا اور اس کو ڈستا رہے گا کیونکہ اس شخص نے مال کے ساتھ محبت کی ہے اور اللہ کی محبت کو چھوڑا ہے۔

حج کی روح منفی عقل کو توڑنا ہے۔ جس طرح نماز کے اندر عبدیت ہے۔ روزے کے اندر تقویٰ اور بہیمیت کا مقابلہ ہے اور زکوٰۃ کے اندر حبِّ مال کا توڑ ہے۔ اسی طرح حج کے اندر منفی عقل کا توڑ ہے۔ منفی عقل انسان کو اللہ تعالیٰ سے باغی بناتی ہے۔ حج کے اندر منفی عقل کو ختم کر کے اس عقل پہ لایا جاتا ہے جو اللہ پاک کا محبوب بناتی ہے۔ یہی بات سمجھانے کے لئے کچھ اشعار سنائے جاتے ہیں:

جو عقل نفس سے اثر لے عقل نفسانی ہے
جو ہو ایمان سے ہو منور عقل ایمانی ہے
عقلِ نفسانی کی محدود نظر کیا سمجھے
عقل ایمانی پہ ہوتی اس کو حیرانی ہے

تشریح:

عقلِ نفسانی حیران ہوتی ہے کہ دیکھو اپنے مال میں سے زکوٰۃ دے رہا ہے۔ روزہ رکھ رہا ہے اور پورا دن کھاپی نہیں رہا۔

ایک مرتبہ میں جہاز میں رؤیتِ ہلال کمیٹی کے اجلاس کے سلسلے میں کراچی جارہا تھا۔ میرے ساتھ ایک Polish Engineer (پولینڈ کا انجینئر) بیٹھا ہوا تھا۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا: کیا آپ کا بھی روزہ ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ اس نے کہا: روزہ بڑی اچھی چیز ہے لیکن آپ لوگ جو پانی نہیں پیتے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ پانی تو جسم کے لئے بہت ضروری ہے۔

دراصل عیسائی لوگ روزے کے دوران پانی پیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے روزے میں کافی تبدیلیاں کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں زیادہ پُر آسائش کھانا نہ ہو، بس عام سا کھانا کھالو تو یہ روزہ ہے۔ ان کا روزہ یہی ہے۔ انہوں نے ہر چیز کے اندر ایسی تبدیلیاں کی ہیں کہ وہ اصل چیز رہی ہی نہیں۔ بہر حال اس نے کہا کہ آپ روزے میں پانی نہیں پیتے، یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ اگر اس کو شریعت کی باتیں بتاؤں تو یہ نہیں سمجھے گا۔ میں نے اس سے کہا: ڈاکٹر حضرات کہتے ہیں کہ جس نے پانی بالکل نہ پیا ہو اگر اسے 72 گھنٹے سے پہلے پہلے پانی مل جائے تو اس پانی کے نہ ملنے کی وجہ سے جو نقصان جگر کو یا گردے کو ہوا ہے یا کسی اور عضو کو ہوا ہے اس کی تلافی ہو جائے گی۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کی صحت کو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔ (یہ بات بالکل صحیح ہے، دراصل یہ 72 گھنٹوں سے زیادہ کی بات ہے، میں نے احتیاطاً 72 گھنٹے کہا) ہمارا روزہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ کا نہیں

ہو تا لہٰذا پانی نہ پینے سے جو نقصان ہوا وہ قابلِ تلافی ہے۔ اس لئے یہ پانی نہ پینا ایک مجاہدہ ہے اور اس سے کوئی نقصان بھی نہیں ہے۔ یہ سن کر اس نے کہا: "then it is ok" پھر تو یہ صحیح ہے۔

لوگوں نے اس قسم کی باتیں اپنے ذہن میں بنائی ہوتی ہیں۔ اصل میں یہ نفس کی باتیں ہوتی ہیں، اور نفس کی خوشی کے لئے ہی کر رہے ہوتے ہیں۔

عقلِ ایمانی کا دل سے ہے تعلق اس لئے
چاہئے اس کو ہمیشہ قلبِ نورانی ہے

تشریح:

عقلِ ایمانی کا تعلق دل سے ہے کیونکہ ایمان دل میں ہوتا ہے۔ **"اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَ تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ"**۔

لہٰذا جو قلب نورانی ہوگا اس کو عقلِ ایمانی نصیب ہو چکی ہوگی۔

نفس کے جو بھی تقاضے ہوں بے مہار ان کو
دبائیں، ٹھیک ہوں تو اس میں ہی آسانی ہے

تشریح:

اگر ہم نفس کے تقاضوں کو دبا سکیں تو پھر سبحان اللہ نفس قابو میں آجائے گا۔ جب نفس قابو میں آجائے گا تو پھر یہ ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔ میں اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں۔ شوگر کے مریض کو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میٹھی چیز نہ کھائیں، اس سے نقصان ہو گا۔ ڈاکٹر اس کو سب چیزیں سمجھاتا ہے، اور اس وقت مریض عقل کی حالت میں ہوتا ہے کیونکہ عموماً شوگر کے مریض چالیس سال سے زیادہ عمر کے ہوتے ہیں۔ اب تو بچوں کو بھی شوگر کا عارضہ ہونے لگا ہے لیکن زیادہ تر چالیس سال سے زیادہ کے عمر کے لوگوں کو شوگر کا عارضہ پیش آتا ہے۔ یہ عمر دوسروں کو عقل سکھانے والی ہوتی ہے۔ لیکن جب میٹھی چیز اس کے سامنے آجاتی ہے تو وہ ساری باتیں بھول جاتا ہے اور میٹھی چیز کھالیتا ہے۔ اپنے آپ کو نقصان پہنچالیتا ہے۔ سب لوگ میری بات کی گواہی دیں گے۔ آج کل ہر ایک آدمی چائے پیتا ہے۔ چائے میں چینی بھی ڈالتے ہیں۔ اگر کوئی شخص بغیر چینی کے چائے پینا چاہے، خواہ اسے پھیکی ہی لگے۔ تو اس کا یہ مجاہدہ صرف ہفتہ دو ہفتہ کا ہو گا، اس کے بعد وہ اس کے ساتھ عادی ہو جائے گا۔ پھر اسے چائے پھیکی نہیں لگے گی اور وہ آرام سے پی لے گا بلکہ اس کو اگر میٹھی چائے دیں گے تو وہ اس کے ساتھ تھوڑا سا اجنبی محسوس کرے گا۔ اب میٹھی چائے اس کے گلے کو لگے گی۔ بس آدمی ایک دو ہفتے مجاہدہ کرلے تو دو ہفتوں بعد آسانی ہو جائے گی اور کوئی نقصان بھی نہیں ہو گا۔ یہی بات ہمارے روحانی ڈاکٹر حضرات بھی کہتے ہیں لیکن ہم لوگ نہیں سنتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس ہمارے اوپر سوار ہوتا ہے۔

اس طرح نفس کا پھر عقل پہ غلبہ نہ رہے
نہ رہے اس پہ نفس کی جو حکمرانی ہے

تشریح:

یعنی ہمارا نفس ہماری عقل کے اوپر غلبہ حاصل نہ کر سکے اور جو حکمرانی ہم پہ کر رہا ہے وہ نہ کر سکے۔

نفس مطمئن، قلب سلیم ہو، اور فہم رسا
نصیب میں ان کی پھر زمین کی سلطانی ہے

تشریح:

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اللہ پاک نے زمین پہ جو حکمرانی دی تھی اس کی وجہ یہی تھی کہ ان کو اپنے نفس پہ پورا قابو تھا۔ وہ نفس کے لئے کام نہیں کرتے تھے۔ وہ صرف اللہ کے لئے کرتے تھے۔ جہاں پر بھی نفس کی بات آجاتی وہ اس کو چھوڑ دیتے اور اس سلسلہ میں جو حکم اللہ کی طرف سے ہوتا تھا اس کے اوپر عمل کرتے تھے۔ نتیجتاً وہ پوری دنیا کے حکمران بنے۔

عقبیٰ محفوظ ہو راضی ہو رب اور جنت میں
شبیرؔ ملے گی انہیں رب کی جو مہمانی ہے

تشریح:

اللہ پاک کا قرآن میں وعدہ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَ لَا تَحۡزَنُوۡا وَ اَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ۝ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ ۝ نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ﴾(حم السجدہ:30-32)

ترجمہ: ”(دوسری طرف) جن لوگوں نے کہا ہے کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر بیشک فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اتریں گے کہ نہ کوئی خوف دل میں لاؤ، نہ کسی بات کا غم کرو، اور اس جنت سے خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم دنیا والی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی تھے، اور آخرت میں بھی رہیں گے۔ اور اس جنت میں ہر وہ چیز تمہارے ہی لئے ہے جس کو تمہارا دل چاہے، اور اس میں ہر وہ چیز تمہارے ہی لئے جو تم منگوانا چاہو یہ سب کچھ اس ذات کی طرف سے پہلی پہل میزبانی ہے جس کی بخشش بھی بہت ہے جس کی رحمت بھی کامل“۔

یہ بات تو آپ کو سمجھ آ گئی۔ اب یہ سمجھیں کہ حج کے اندر ہمیں کیا کرنا ہے۔ جو عشاق نے کیا ہے وہی ہم نے کرنا ہے۔ جو صحیح معنوں میں اللہ کے عاشق تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت ہاجرہ بی بی رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ انہوں نے جو کیا ہم نے بھی ان کی نقل کرنی ہے، ان کی طرح کام کرنا ہے۔ اگر جذبہ وہی ہو جو ان کا تھا اور عمل بھی وہی ہو جو ان کا تھا تو ان شاء اللہ اس کا اثر ہم پہ وہی ہو گا جو ان پہ تھا۔ الحمد للہ یہ ہمارے پاس ایک بہترین ذریعہ ہے جس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

احرام کی جو دو چادریں باندھی جاتی ہیں اس کی حکمت یہ ہے کہ اس میں انسان اپنی پُر آسائش زندگی کو کم سے کم ضرورت کے تحت لاتا ہے۔ مثلاً اپنے آپ کو کم سے کم کتنے کپڑوں میں چھپایا جا سکتا ہے، اس کے لئے دو چادریں ہی کافی ہیں۔ پھر ہم خانہ کعبہ کا چکر لگاتے ہیں۔ اللہ جل شانہ نے خانہ کعبہ کو اس دنیا میں اپنے بندوں کے لئے سجدہ گاہ بنایا ہوا ہے۔ اس کی طرف سجدہ کیا جاتا ہے۔ خانہ کعبہ کو سجدہ کرنا ایسا ہے جیسے اللہ کو سجدہ کرنا۔ حجرِ اسود کو بوسہ دینا ایسا ہے جیسے اللہ کے ہاتھ میں ہاتھ دینا۔ ملتزَم شریف کے ساتھ معانقہ کرنا ایسا ہے جیسے اللہ کے ساتھ معانقہ کرنا اور خانہ کعبہ کا طواف کرنا ایسا ہے جیسے اللہ کے ساتھ چکر لگانا۔ یہ سب باتیں اگرچہ حقیقت میں ممکن نہیں ہیں لیکن یہ آپ کو وہ کیفیت ضرور دے سکتی ہیں جو کہ حقیقت میں ایسا ہونے سے حاصل ہوتیں۔ لیکن ایسا تب ہی ہو گا جب آپ کے ذہن میں اس کیفیت کا استحضار ہو۔ اگر آپ کے ذہن میں یہ بات مستحضر نہ ہو اور آپ مشینی انداز میں سات چکر لگا لیں تو آپ کا طواف ہو تو جائے گا لیکن یہ طواف برائے طواف ہو گا یہ اصل طواف نہیں ہے بس آپ نے ویسے ہی چکر لگا

لیا ہے۔ خدا کے بندے تم کہاں پر موجود ہو؟ تم کس کو یاد کر رہے ہو؟ اللہ کو چھوڑ کر اپنے لوگوں کو یاد کر رہے ہو تو پھر تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔ لہٰذا وہاں سب کچھ بھول جاؤ صرف اللہ کو یاد رکھو۔ "**لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَ النِّعْمَةَ لَكَ وَ الْمُلْكَ، لَا شَرِيْكَ لَكَ**"۔ یہی ہے حج کی کیفیت۔ یہ "**لَبَّيْكَ**" کے اندر موجود ہے۔ "**لَبَّيْكَ**" کے معنی پہ غور کریں کہ اس میں ہم کہتے کیا ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں عاشقوں کی طرح طواف کرو۔ جب عاشق اپنے محبوب کے پاس جاتا ہے تو اسے کوئی اور یاد نہیں رہتا۔ کیا اسے کوئی یاد ہوتا ہے؟ اسے اپنا باپ یاد ہوتا ہے؟ اپنی ماں یاد ہوتی ہے؟ اپنے دوست یاد ہوتے ہیں؟ اپنا دفتر یاد ہوتا ہے؟ اسے کوئی یاد نہیں ہوتا۔ پس جب تم خانہ کعبہ جاؤ تو تمھاری یہی کیفیت ہونی چاہئے کہ بس مجھے تو اللہ ہی چاہئے۔ اللہ بہت قریب ہے اور اللہ کی رحمت بہت زیادہ ہے، اللہ ہم پر ہم سے زیادہ مہربان ہے۔ خدا کی قسم اگر ہم ذرا سا بھی اس کی طرف جائیں تو وہ مکمل ہماری طرف توجہ فرمائیں گے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ میری طرف جو ایک بالشت آتا ہے میری رحمت اس کی طرف دو بالشت جاتی ہے۔ میری طرف جو ایک ہاتھ آتا ہے میری رحمت اس کی طرف دو ہاتھ جاتی ہے۔ میری طرف جو چل کے آتا ہے میری رحمت اس کی طرف دوڑ کے جاتی ہے۔ اس لئے ہمیں اللہ کی طرف متوجہ ہونا سیکھنا چاہئے۔

حضرت ہاجرہ بی بی رضی اللہ عنہا وہاں پر اپنے بچے کے لئے پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں۔ پانی پینا ایک دنیاوی چیز ہے۔ انہوں نے وہاں رہنا اللہ کے لئے قبول کیا تھا۔ حضرت ابراہیم

علیہ السلام سے کہا تھا کہ اگر اللہ کا حکم ہے تو پھر ہمیں کوئی پروا نہیں ہے آپ جاسکتے ہیں۔ اللہ نے اس بات کو ایسا پسند فرمایا کہ اب جتنے بھی حج کرنے والے ہیں سب کو دوڑنا پڑتا ہے، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی دوڑنا پڑا، بعد میں آنے والے تمام انبیاء کو دوڑنا پڑا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دوڑنا پڑا۔ جتنے اولیاء کرام ہیں سب دوڑتے ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ وہاں پر ایک عورت دوڑی تھی، لیکن دوڑنے کا حکم مردوں کے لئے ہے۔ ذرا غور تو کریں کہ یہ ہمیں کون سی چیزیں سکھائی جا رہی ہیں۔

پھر عرفات کا میدان ہے۔ سبحان اللہ کیا بات ہے عرفات کے میدان کی۔ وہاں پر تو ایسی کیفیات ہیں کہ انسان الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔

ہم نے اس کتاب (شاہرائے محبت) کے اندر ان روحانی کیفیات کو سمویا ہے۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ اس کے بارے میں کچھ بتادیا جائے۔ انسان کا عمل اپنا اپنا ہے۔ مجھے ایک بھائی کی بات بہت پسند آئی۔ ہمارے دفتر کے آدمی تھے۔ انہوں نے ایک تکنیکی بات کی، کہنے لگے کہ ذرا حساب لگالو کہ ہم نے کتنا خرچ کیا ہے۔ آج کل ہم تقریباً گیارہ لاکھ خرچ کر کے وہاں جاتے ہیں اور ان گیارہ لاکھ میں صرف چالیس دن ہم وہاں رہتے ہیں۔ اگر ہم یہ ایام اور یہ اوقات گھنٹے کسی ایسی چیز میں خرچ کرتے ہیں جس میں ہم صرف دو ریال بچائیں، تو کیا یہ دو ریال بچانے کے لئے ہم نے اتنے پیسے لگائے؟ دو ریال کو بچانے کے لئے ہم نے اتنے پیسے نہیں لگائے۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

مجھے ایک بہت بڑے بزرگ نے فرمایا: شبیر! جب حج پہ جاؤ تو وہاں پیسوں کے خرچ کی پروانہ کرو بلکہ وقت بچاؤ، وہ وقت حرم کو دو۔ پیسے نہ بچاؤ۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر ہم لوگ اس جذبے کے ساتھ جائیں گے تو پھر ہمارا حج حقیقی حج ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسا حج نصیب فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

vvv

تعلیماتِ مجدّدیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ

اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَ الْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحَاتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ (العصر:1-3) صَدَقَ اللّٰہُ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ

ترجمہ: ”زمانے کی قسم! انسان در حقیقت بڑے گھاٹے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائیں، اور نیک عمل کریں، اور ایک دوسرے کو حق بات کی نصیحت کریں، اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کریں“۔

معزز خواتین و حضرات! ابھی میں نے آپ کے سامنے سورۃ العصر تلاوت کی ہے۔ اس میں اللہ جل شانہ زمانے کی قسم کھا کر ارشاد فرماتے ہیں کہ بے شک انسان خسارے میں ہے، مگر وہ انسان خسارے سے بچے ہوئے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں، جنہوں نے نیک اعمال کئے ہیں، جو حق کی وصیت کرتے ہیں اور صبر کی تلقین کرتے ہیں۔

اس سورت میں اعمال صالحہ کا ذکر ایمان کے بعد دوسرے نمبر پر کیا گیا ہے۔ چوں کہ عقائد کے بارے میں تفصیل کے ساتھ بات ہو چکی ہے۔ اس وجہ سے اب اعمال صالحہ کی بات چل پڑی ہے۔ اعمالِ صالحہ میں سب سے پہلے نماز کا ذکر آتا ہے۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات شریفہ میں جس طریقہ سے ان چیزوں کو اپنے متعلقین کے لئے واضح فرمایا تھا اور انہیں تلقین فرمایا تھا، اسی طریقہ سے ان چیزوں کو ہم آج بیان کریں گے ان شاء اللہ۔ ظاہر ہے کہ دین تو سمندر ہے اور علم کے سمندر کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا، لیکن اِس وقت ہم صرف وہ مضامین بیان کریں گے، جو حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائے ہیں۔

ہم حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ کے بیان کردہ مضامین کیوں بیان کرتے ہیں؟ ہمیں اس کی کیا ضرورت ہے؟ اگرچہ یہ مضامین دوسری کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً نماز کے بارے میں تفصیل نماز کی کتابوں میں موجود ہے۔ یہ کوئی نئی بات تو ہے نہیں کہ جسے صرف مجدد صاحب رحمہ اللہ نے بیان فرمایا ہو۔

دراصل ہر شخص پر اس کا اپنا مسلک اور طریقہ حجت ہوتا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مجددی کہتا ہے اور پھر اُن غلطیوں میں مبتلا ہے، جن کی تصحیح حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کر چکے ہیں۔ تو اُس کے اوپر مجدد صاحب رحمہ اللہ کا قول حجت ہو گا۔ اُس کے سامنے جب مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی باتوں کو رکھا جائے گا تو وہ انکار نہیں کر سکے گا، بلکہ اپنی اصلاح کرے گا۔ یہ بنیادی بات ہے۔

الحمدللہ! چوں کہ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بہت بڑا حلقہ ہے، اس لئے مجددی حضرات کے لئے یہ ایک نعمت غیر مترقبہ ہے کہ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات شریفہ کے ذریعہ سے ان کو یہ باتیں پہنچ جائیں۔

اصل میں ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ الحمدللہ ہم تو سارے سلسلوں کی بات کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تفریق نہیں ہے، اگرچہ الحمدللہ ہماری اپنی نسبت نقشبندی ہے۔ جیسا کہ ہمارے شیخ نے فرمایا تھا۔ لیکن ہم صرف اپنی بات نہیں کرتے، ہم سارے سلسلوں کی بات کرتے ہیں، کیوں کہ ہمارے لئے سارے سلسلے محترم ہیں، اس لئے ہم جس وقت بھی بات کرتے ہیں، کسی خاص سلسلہ کی بات نہیں کرتے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اپنے بڑوں سے جو سیکھا ہے، وہ ہمارے لئے بہت بڑا سرمایہ ہے۔

مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات جو اللہ تعالیٰ نے ہم تک اُن حضرات کی توجہات کی برکت سے پہنچائی ہیں۔ یہ ہمارے پاس مجددی حضرات کی ایک امانت ہے۔ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہزار سال کے مجدد ہیں۔ لہٰذا پورے ہزار سال جو آنے والے ہیں، ان کے اوپر حضرت کا فیض پھیلا ہوا ہے۔ گذشتہ چار سو سال سے چلا ہوا ہے اور اگر دنیا کی زندگی رہی اور دنیا باقی رہی، تو مزید چھ سو سال تک بھی جاری رہے گا۔ ان شاءاللہ۔ لیکن اس بات میں ایک بڑا عجیب نکتہ ہے، افسوس کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو وہ نکتہ سمجھ نہیں آتا۔ وہ نکتہ یہ ہے کہ جب حدیث شریف میں آگیا کہ ہر صدی کی ابتداء میں ایک مجدد آئے گا۔ دین کے اندر جو نئی چیزیں پیدا ہو چکی ہوں گی، وہ اُن کو نکالے گا۔ یہ حدیث شریف تو قیامت تک کے لئے ہے۔ جب

آپ صلی اللہ علیہ وسلم دین کی تکمیل کر چکے، لیکن اس کے بعد بھی مجدد کی ضرورت ہے تو کیا مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد مجدد کی ضرورت نہیں ہو گی؟ بالکل مجدد کی ضرورت ہو گی۔ اس بات کو سمجھنا چاہئے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بھی مجدد تھے۔ ان کا اپنا فیض تھا۔ اُس وقت اُس صدی کے مجدد شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ لیکن ان کے ساتھ مجددی نسبت باقاعدہ ملی ہوئی تھی، اگرچہ ان کا اپنا ایک اثر بھی تھا۔ لہذا جن لوگوں کو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مناسبت تھی، ان کے لئے مسئلہ بہت آسان تھا۔ ان کے لئے سمجھنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

اسی طرح جب سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ آئے، تو چوں کہ وہ بھی مجدد تھے، اس لئے ان کے ساتھ بھی مجددی نسبت شامل تھی۔ لیکن ان کی اپنی خاص نسبت میں جن لوگوں کو ان کے ساتھ مناسبت تھی، ان کے لئے بہت فائدہ تھا۔

پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی مجددی ہیں، کیوں کہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ بھی پہلے نقشبندی تھے، بعد میں چشتی ہو گئے۔ گویا ان میں دونوں رنگ ہیں اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ انہی کے خلیفہ ہیں۔ اس لحاظ سے مجددی نسبت ان میں بھی شامل ہے، لیکن ان کا اپنا رنگ بھی موجود ہے۔ لہذا آج کل کے دور میں دونوں مجددوں کے ساتھ اپنی مناسبت رکھنی چاہئے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی مناسبت ہو اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی۔ تب بات بنتی ہے۔

لیکن ہمارے بعض مجددی حضرات اس بات کو نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ ہمارے لئے یہی بات کافی ہے کہ ہم مجددی ہیں۔ یہ تو بالکل وہی بات ہو گئی، جو بعض غیر مقلد کہتے ہیں کہ ہم محمدی ہیں، ہمیں حنفیت کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں شافعیت کی کیا ضرورت ہے؟ نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ ہم سب محمدی ہیں لیکن اس کے ساتھ حنفی بھی ہیں۔ اسی طرح جو شافعی، مالکی یا حنبلی ہیں، وہ بھی محمدی ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں جو مجددی تھے، وہ مجددی ہونے کے ساتھ ولی اللّٰہی بھی تھے۔ سید احمد رحمہ اللہ کے دور میں مجددی حضرات، مجددی ہونے کے ساتھ ساتھ احمدی (یعنی سید احمد شہید رحمہ اللہ سے نسبت رکھنے والے) بھی تھے۔ اور اب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دور میں مجددی حضرات تھانوی بھی ہیں۔

اس لئے ہم تو الحمدللہ سب سے نفع اٹھاتے ہیں۔ لہٰذا درمیان میں کوئی ایسی بات نہیں آتی کہ جس میں ہمارے لئے کوئی اشکال ہو یا کوئی مشکل ہو۔ لیکن بہر حال ہم یہ بات ضرور کریں گے کہ ہمیں اس بات کو جاننا اور سمجھنا چاہئے۔

حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مکتوب نمبر 304 میں ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ یہ فقیر مدت تک اس تردد میں رہا کہ اعمالِ صالحہ سے مراد وہ کون سے اعمال ہیں جن پر حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن مجید کی اکثر آیات میں دخولِ بہشت کے وعدہ کو موقوف فرمایا ہے؟ آیا تمام اعمالِ صالحہ مراد ہیں یا ان میں سے بعض ہیں؟ اور اگر تمام اعمالِ صالحہ مراد ہیں، تو یہ امر تو بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ تمام اعمالِ صالحہ کے بجالانے کی

توفیق شاید ہی کسی کو حاصل ہو۔ اور اگر بعض اعمالِ صالحہ مراد ہیں تو یہ بات مجہول اور غیر معین ہے کہ وہ کون سے بعض مراد ہیں۔ آخر محض فضلِ خداوندی جل سلطانہ سے یہ بات دل میں آئی کہ اعمالِ صالحہ سے مراد شاید اسلام کے پانچ ارکان (کلمہ شہادتِ توحید ورسالت، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج) ہیں جن پر اسلام کی بنیاد ہے۔

تشریح:

"بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ"۔(بخاری، حدیث نمبر:8)

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔

متن:

اگر اسلام کے اصولِ پنجگانہ کامل طور پر ادا ہو جائیں، تو امید ہے کہ فلاح و نجات حاصل ہو جائے گی۔ کیوں کہ یہ اپنی ذاتی حدود میں اعمالِ صالحہ ہیں اور تمام برائیوں سے اور منکرات سے روکنے والے ہیں۔

تشریح:

حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بڑا عجیب نکتہ بیان فرمایا ہے۔ اگر صحیح معنوں میں نماز پڑھی جائے تو نماز کی صفت **﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ﴾(العنکبوت:45)**

ترجمہ: "بے شک نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے"۔

یہ نافذ ہو جائے گی اور اس کے مطابق اصلاح ہو جائے گی۔ اگر صحیح معنوں میں روزے رکھے جائیں تو تقویٰ نصیب ہو جائے گا۔ صحیح معنوں میں زکوٰۃ دی جائے تو بخل سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ صحیح معنوں میں حج کیا جائے تو عشق و محبت بھی حاصل ہو جائے گی۔

الغرض ساری چیزیں ان اعمال کے اندر موجود ہیں۔ لیکن چوں کہ ہم (ان اعمال کی ادائیگی میں) کمی کرتے ہیں، تبھی ان (مقاصد کے حصول) میں مسئلہ ہوتا ہے۔ اور اصلاح کا نظام ان کمیوں کو دور کرنے کے لئے ہے۔ اگر یہ کمیاں نہ ہوں، تو پھر تو کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں۔ اور یہ (یعنی کمیوں کی اصلاح کرنا) قرآن اور احادیثِ شریفہ سے ثابت ہے۔

متن:

مثلاً: نماز کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ﴾ (العنکبوت:45)

ترجمہ: "بیشک نماز تمام بے حیائیوں اور برے کاموں سے روکتی ہے"۔

یہ آیت اس معنی پر شاہد ہے۔ اور جب اسلام کے ان پنجگانہ ارکان کا بجا لانا میسر ہو جائے، تو امید ہے کہ حق تعالیٰ کا شکر بھی ادا ہو گیا اور جب شکر ادا ہو گیا تو عذاب سے بھی نجات حاصل ہو گئی کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

﴿مَا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ﴾ (النساء:147)

ترجمہ: ”اگر تم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور اس پر ایمان لے آؤ تو وہ تمہیں کیوں عذاب دے گا“۔

پس ان پنجگانہ ارکان کی ادائیگی میں دل و جان سے کوشش کرنی چاہئے۔ خاص طور پر نماز کے قائم کرنے میں جو دین کا ستون ہے۔ جہاں تک ہو سکے اس کے آداب میں سے کسی ادب کے ترک کرنے پر راضی نہ ہونا چاہئے اور فرض، سنت، مستحب میں سے کسی کو بھی ترک نہیں کرنا چاہئے۔ اگر نماز کو کامل طور پر ادا کر لیا تو گویا اسلام کی اصل عظیم نعمت حاصل ہو گئی اور نجات کے لئے حبل متین یعنی مضبوط رسّی مل گئی۔ وَ اللّٰہ سُبْحَانَہُ الْمُوَفِّقُ (اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے)۔

تشریح:

دیکھیں! ماشاء اللہ اعمال صالحہ کی کیسی آسان تشریح فرمائی۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ ایمان کے بعد اعمالِ صالحہ کا ذکر ہے اور اعمال صالحہ میں پہلا نمبر نماز کا ہے۔ اس کے بارے میں مکتوب نمبر 67 جلد دوم میں ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

عقائد کے درست ہونے کے بعد شرع کے اوامر کی تعمیل اور نواہی سے پرہیز کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ جن کا عمل سے تعلق ہے، ان سے چارہ نہیں ہے۔ پانچوں وقت نماز کو سستی و کاہلی کے بغیر تعدیلِ ارکان کے ساتھ باجماعت ادا کرنا چاہئے، کیوں کہ کفر اور اسلام کے درمیان فرق ظاہر کرنے والی صرف نماز ہی ہے۔ جب مسنون طریقے پر نماز ادا کرنا میسر ہو جائے گا، تو

سمجھو کہ اسلام کی مضبوط رسی ہاتھ میں آ گئی، کیوں کہ اسلام کے پنجگانہ اصول میں سے دوسری اصل نماز ہے۔

اصلِ اول اللہ تعالیٰ جل شانہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانا ہے۔ اصلِ دوم نماز ہے۔ اصلِ سوم زکوٰۃ کا ادا کرنا ہے۔ اصلِ چہارم ماہ رمضان کے روزے ہیں۔ اصلِ پنجم حجِ بیت اللہ ہے۔

اصلِ اول کا تعلق ایمان کے ساتھ ہے۔ باقی چار اصول کا تعلق اعمال کے ساتھ ہے۔ ان میں تمام عبادتوں کو جامع ترین اور افضل ترین طریقے سے ادائیگی (عبادت) کا نام نماز ہے۔ قیامت کے دن حساب کی ابتداء نماز ہی سے ہو گی۔ اگر نماز درست ہوئی، تو باقی دوسری باتوں کا محاسبہ بھی اللہ تعالیٰ سبحانہ کی عنایت سے آسانی سے گزر جائے گا۔ جہاں تک ہو سکے، شرعی ممنوعات سے بچنا چاہئے۔ مولیٰ جل شانہ کی نامرضیات کو زہرِ قاتل سمجھنا چاہئے۔ اپنے قصوروں کے مواد کو ہر وقت نظر میں رکھنا چاہئے۔ اپنی کارگزاریوں پر نادم اور شرمندہ ہونا چاہئے اور ندامت و حسرت اٹھانی چاہئے کہ بندگی کا طریقہ یہی ہے۔ وَ اللّٰہُ سُبْحَانَہُ الْمُوَفِّقُ (اور اللہ سبحانہ ہی توفیق دینے والا ہے)۔

دفترِ اول، مکتوب نمبر 137 میں نماز کی بلندیِ شان یوں بیان فرماتے ہیں:

متن:

جاننا چاہئے کہ وہ لذت، جو عین نماز کی حالت میں حاصل ہوتی ہے۔ اس میں نفس کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ عین اس لذت کے وقت نالہ وفغاں میں ہوتا ہے۔ سبحان اللہ! کیا بلند مرتبہ ہے! مصرع

"هَنِيْئًا لِّاَرْبَابِ النَّعِيْمِ نَعِيْمُهَا"۔

ترجمہ: "اربابِ نعمت کو نعمتیں مبارک ہوں"۔

ہم جیسے ابو الہوس (حریص آدمیوں) کو اس قسم کی باتوں کا کہنا اور سننا بھی بسا غنیمت ہے۔ مصرع

"بارے ہیچ خاطرِ خود شادی کنم"۔

ترجمہ: "اسی خیال سے میں اپنے دل کو خوش کرلوں"۔

اور نیز جان لیں کہ دنیا میں نماز کا مرتبہ آخرت میں رؤیتِ باری تعالیٰ کے مرتبہ کی مانند ہے۔ دنیا میں نہایتِ قرب، نماز کے اندر ہے اور آخرت میں نہایتِ قرب، اللہ تعالیٰ کے دیدار کے وقت ہو گا۔

اور یہ بھی جان لیں کہ باقی تمام عبادات نماز کے لئے وسیلہ ہیں اور اصل مقصد نماز ہی ہے۔ وَالسَّلَامُ وَالْاِكْرَامُ

تشریح:

حضرت نے ارشاد فرمایا ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا قرب، رؤیتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ملے گا اور اس دنیا میں نماز کے ساتھ ملتا ہے، کیوں کہ نماز کے بارے میں فرمایا گیا:

"اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِ"۔(مرقاۃ المفاتیح،ج:2،ص:624)

ترجمہ:"نماز مؤمن کے لئے معراج ہے"۔

ذرا غور کر لیں! جس وقت ہم تکبیرِ تحریمہ یعنی "اَللّٰہُ اَکْبَرُ" کہتے ہیں، تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب یہ آدمی اِدھر نہیں رہا، اب یہ اللہ کے پاس ہے اور جس وقت وہ اس حالت سے واپس آئے گا، تو "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ، اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَ رَحْمَۃُ اللّٰہِ" کہنے کے ساتھ دوبارہ دنیا میں واپس آئے گا۔ اس وجہ سے فرمایا کہ اس لحاظ سے دنیا میں نماز ایسے ہے، جیسے آخرت میں رؤیتِ باری تعالیٰ ہے۔

نماز کی اہمیت کے بارے میں مکتوب نمبر 20 دفتر دوم میں ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

(جاننا) چاہئے کہ اعمال میں بہترین عمل اور عبادات میں بہترین عبادت، اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنا ہے۔ جو دین کا ستون اور مؤمن کی معراج ہے۔ اس لئے اس کے ادا کرنے میں بہت اہتمام کرنا چاہئے اور کامل احتیاط برتنی چاہئے۔ تاکہ نماز کے ارکان و شرائط اور سنن و آداب کما حقہ ادا ہو جائیں۔ طمانیت اور تعدیلِ ارکان کے بارے میں بار بار تاکید کی جاتی ہے کہ ان کی اچھی طرح محافظت کریں۔ اکثر لوگ نماز کو ضائع کر دیتے ہیں اور طمانیت و تعدیلِ ارکان کو درہم برہم کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے حق میں بہت سی وعیدیں اور تہدیدیں وارد ہوئی ہیں۔ جب

نماز درست ہو جائے، تو نجات میسر ہو جانے کی بڑی امید ہے، کیوں کہ نماز کے قائم ہونے سے دین قائم ہو جاتا ہے اور عروج کا مرتبہ اپنی معراج کو پہنچ جاتا ہے۔

باجماعت نماز کی اہمیت، آدابِ وضو اور آداب نماز کے بارے میں مکتوب نمبر 266 دفترِ اول میں ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

اول، وضو کامل اور پورے طور پر کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ ہر عضو کو تین بار باتمام و کمال دھونا چاہئے، تاکہ سنت کے طریقہ پر وضو ادا ہو۔ اور سر کا مسح بالاستیعاب یعنی سارے سر کا مسح کرنا چاہئے اور کانوں اور گردن کے مسح میں خوب احتیاط کرنی چاہئے اور بائیں ہاتھ کی خنصر یعنی چھنگلیا سے پاؤں کی انگلیوں کے نیچے کی طرف سے خلال کرنا لکھا ہے، اس کی رعایت رکھنی چاہئے۔ اور مستحب کے بجالانے کو معمولی نہ سمجھیں۔ مستحب حق جل و علا کے نزدیک پسندیدہ اور محبوب عمل ہے۔ اگر تمام دنیا کے عوض اللہ تعالے کا ایک پسندیدہ اور محبوب فعل معلوم ہو جائے اور اس کے مطابق عمل میسر ہو جائے، تو غنیمت ہے۔

تشریح:

یہاں پر ایک بہت بڑی بات سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ مستحب کا معنی ہے پسندیدہ۔ مستحب کس کا پسندیدہ ہے؟ اللہ کا پسندیدہ ہے۔ پس جو عمل اللہ کا پسندیدہ ہے۔ اس کو کم سمجھنا انتہائی درجہ کی کمزوری کی بات ہے۔ اس لئے کبھی بھی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج میں مستحبات کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن یہ ساری باتیں اپنی ذات تک محدود ہیں کہ انسان اپنے طور پر اپنے اوپر

مستحبات کو نافذ کرے۔ دوسروں کے بارے میں **"ظُنُّوْا بِالْمُؤْمِنِيْنَ خَيْرًا"** کا حکم ہے۔ اگر کوئی شخص مستحب ادا نہیں کر رہا تو آپ اس کو ملامت نہیں کر سکتے۔ ملامت کرنے پر پابندی ہے، کیوں کہ جب اللہ نے ملامت نہیں کی، تو آپ کون ہوتے ہیں ملامت کرنے والے؟

یہ ٹھیک ہے کہ مستحب ادا کرنے پر اس کی promotion (ترقی) ہے۔ لیکن اللہ جل شانہ نے اس کو options (اختیارات) دیئے ہیں کہ چاہو تو کرو اور چاہو تو نہ کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا: اگر چاہو تو مستحب پر عمل کر لو۔ اس لئے مستحب ادا نہ کرنے پر دوسروں کو ملامت نہیں کرنا چاہیئے۔

آج کل ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کے لئے تیز ہوتے ہیں اور اپنے لئے سُست ہوتے ہیں۔ یہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ اپنے لئے تیز ہونا چاہیئے اور دوسروں کے لئے یہ خیال کرنا چاہیئے کہ ممکن ہے اس کا کوئی عذر ہو۔ بعض دفعہ واقعۃً عذر ہوتا بھی ہے۔ اگر عذر نہ بھی ہو، تو جب اللہ پاک نے اس سے مطالبہ نہیں کیا، تو تم کون ہو مطالبہ کرنے والے؟

اس وجہ سے ترکِ مستحبات پر آپ پکڑ نہیں کر سکتے۔ ہاں شیخ پکڑ کر سکتا ہے۔ شیخ تو مباح عمل کو بھی طریقت کا راستہ بنا سکتا ہے۔ مثلاً: کسی کو کہہ دے کہ بھائی! باہر جو جوتے پڑے ہوئے ہیں، ان کو سیدھا کیا کرو۔ جوتے سیدھے کرنا اس کے لئے مجاہدہ ہو گا۔ اس کے ذریعہ اس کی اصلاح ہو گی۔ ورنہ کون سی کتاب میں لکھا ہے کہ مسجد کے باہر لوگوں کے جوتے سیدھے کیا کرو؟ کسی کتاب میں لکھا ہے؟ کیا جوتے سیدھے کرنا فرض، واجب، سنت یا مستحب ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ عمل نہ فرض ہے، نہ واجب، نہ سنت اور نہ مستحب ہے۔ لیکن اگر شیخ نے آپ کے لئے اس کو ایک مجاہدہ

بنالیاتو آپ کے لئے اس میں فائدہ ہو گا۔ اگر آپ اس میں چُوں چراں (اعتراض) کریں گے، تو کام خراب ہو جائے گا۔

حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ہے۔ جسے مجدد الملت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وعظ میں بیان کیا ہے کہ ایک شخص تھا، جس میں تکبر تھا۔ حضرت نے اس سے فرمایا کہ اخروٹوں کا ٹوکرا اپنے سر پر رکھو اور آواز لگاؤ کہ جو مجھے ایک تھپڑ لگائے گا، اسے ایک اخروٹ ملے گا۔ اُس نے کہا: **اَللّٰہُ اَکْبَرُ!** میں ایسا کام کروں گا؟ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بد بخت! **اَللّٰہُ اَکْبَرُ** ایسا کلمہ ہے، جسے کافر پڑھ لے تو مسلمان ہو جائے، مگر تو نے یہ کلمہ پڑھ کے اپنے آپ کو کافرِ طریقت بنا لیا ہے۔ حضرت نے کافرِ طریقت فرمایا، کافرِ شریعت نہیں فرمایا۔ مطلب یہ تھا کہ تو نے اپنی اصلاح کا راستہ روک لیا ہے، اس کام میں تیری اصلاح تھی۔

آپ کو پتہ ہے کہ خود حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی اصلاح کیسے ہوئی تھی؟ شبلی رحمۃ اللہ علیہ اپنے علاقہ کے گورنر تھے۔ کسی مسئلہ پر بادشاہ کے ساتھ اختلاف ہو گیا تو استعفیٰ دے دیا اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آ گئے کہ حضرت! میری اصلاح فرمادیں۔ حضرت نے فرمایا: آپ ماشاء اللہ اتنے بڑے آدمی ہیں، ہم کہاں آپ کی اصلاح کر سکتے ہیں! لیکن انہوں نے بڑی منت کی تو حضرت جنید رحمہ اللہ نے کہا: اچھا، ٹھیک ہے۔ اب اگر میں آپ سے مال کا مطالبہ کروں کہ اتنا مال دے دیں، تو یہ تو آپ کر نہیں سکتے، کیوں کہ آپ کے پاس مال نہیں ہے۔ میں آپ کو ایک اور طریقہ بتاتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ جس علاقے میں آپ گورنر رہے ہیں، وہاں پر آپ نے ایک سال ریڑھی وغیرہ پر سبزی بیچنی ہے۔ آج کل لوگوں نے پتا نہیں سبزی بیچنے کو کیا سمجھا

ہوا ہے! لیکن خیر! شبلی رحمہ اللہ مخلص تھے، تیار ہو گئے۔ پورا ایک سال سبزی بیچ کر پھر آئے۔ حضرت نے امتحان لیا۔ فرمایا: نہیں، ابھی کچھ کسر ہے، ابھی کچھ خُو بُو باقی ہے۔ پھر دو سال مزید سبزی بیچی۔ تین سال پورے کئے۔ پھر حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے کچھ سوالات کئے تو انہوں نے ان سوالات کے جوابات صحیح دیئے۔ تب حضرت نے ان کو اجازت دے دی اور ماشاء اللہ شبلی سے شیخ شبلی رحمۃ اللہ علیہ بن گئے۔ اور ایسا مقام پایا کہ جنید و شبلی با قاعدہ دونوں کا ایک ساتھ نام آتے ہیں۔ اتنے اونچے مقام پر چلے گئے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ آپ کے لئے تربیت کے طور پر مباح امر بھی لازم کر سکتا ہے۔ شریعت کے طور پر لازم کرنے کا شیخ کو بھی اختیار نہیں۔ لیکن تربیت کے طور پر بڑی گنجائش ہے۔ مثلاً: کوئی چیز آپ نہیں کھاتے، لیکن جب آپ بیمار ہو جائیں، تو ڈاکٹر آپ کو کھلاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ چیز کھاؤ۔ وہ کوئی کھانے کی چیز نہیں ہوتی، لیکن چوں کہ اس میں علاج ہوتا ہے، اس لئے کھانی پڑتی ہے۔ چنانچہ لوگ کھاتے ہیں اور اس سے صحت ہو جاتی ہے۔

بات یہ ہو رہی تھی کہ اپنے لئے تو مستحبات کا بہت زیادہ خیال رکھنا چاہئے۔ لیکن دوسروں کے معاملے میں کافی احتیاط کرنی چاہئے۔ یہاں تک فرمایا کہ اگر کسی نے کسی مستحب کے ساتھ واجب جیسا معاملہ کیا یعنی اس کو واجب اور لازمی سمجھنے لگا تو اس کے لئے اس کا ترک کرنا واجب ہو جائے گا۔ تاکہ اس کا دماغ ٹھیک ہو جائے۔ وہ اس کو واجب کیوں سمجھ رہا ہے؟ یہ مسائل ہیں اور ان کو سمجھنا ہوتا ہے۔

متن:

مستحب حق جل وعلا کے نزدیک پسندیدہ اور محبوب عمل ہے۔ اگر تمام دنیا کے عوض اللہ تعالےٰ کا ایک پسندیدہ اور محبوب فعل معلوم ہو جائے اور اس کے مطابق عمل میسر ہو جائے، تو غنیمت ہے۔ اس کا بعینہ یہی حکم ہے کہ کوئی زخرف ریزوں (یعنی ٹھیکروں) سے نفیس جواہر خرید لے اور بے فائدہ جماد (یعنی پتھر) سے روح کو حاصل کرلے۔ کمالِ طہارت اور کمالِ وضو کے بعد نماز کا قصد کرنا چاہئے جو کہ مومن کی معراج ہے اور کوشش کرنی چاہئے کہ فرض نماز باجماعت ادا ہو، بلکہ امام کے ساتھ تکبیرِ اولیٰ بھی ترک نہیں ہونی چاہئے اور نماز کو مستحب وقت میں ادا کرنا چاہئے۔ قرات میں قدرِ مسنون کو مد نظر رکھنا چاہئے۔ رکوع و سجود میں بھی طمانیت ضروری ہے، کیوں کہ یہ فرض ہے یا بقولِ مختار واجب ہے۔ قومہ میں اس طرح سیدھا کھڑا ہونا چاہئے کہ تمام بدن کی ہڈیاں اپنی اپنی جگہ پر آجائیں اور سیدھا کھڑے ہونے کے بعد طمانیت درکار ہے، کیوں کہ طمانیت فرض ہے یا واجب یا سنت، علی اختلافِ الاقوال۔

تشریح:

یعنی قومہ میں طمانیت کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض حضرات کے نزدیک فرض ہے، بعض کے نزدیک واجب اور بعض کے نزدیک سنت ہے۔

متن:

ایسے ہی جلسہ میں جو دو سجدوں کے درمیان ہے، اچھی طرح بیٹھنے کے بعد اطمینان ضروری ہے، جیسا کہ قومہ میں۔ اور رکوع و سجود کی کم سے کم تسبیحیں تین بار ہیں اور زیادہ سے زیادہ سات بار یا گیارہ بار ہیں، علی اختلافِ الاقوال۔ اور امام کی تسبیح مقتدیوں کے حال کے اندازہ

کے مطابق ہونی چاہئے۔ شرم کی بات ہے کہ انسان تنہا (نماز) پڑھنے کی حالت میں طاقت ہوتے ہوئے اَقل تسبیحات پر کفایت کرے۔ اگر زیادہ نہ ہو سکے تو کم از کم پانچ یا سات بار تو کہے۔ اور سجدہ کرتے وقت اول وہ اعضاء زمین پر رکھے جو زمین کے نزدیک ہیں۔ پس اول دونوں زانو زمین پر رکھے، پھر دونوں ہاتھ، پھر ناک، پھر پیشانی۔ زانو اور ہاتھ زمین پر رکھتے وقت دائیں طرف سے ابتداء کی جائے—اور سر اٹھاتے وقت اول ان اعضاء کو اٹھانا چاہئے جو آسمان سے نزدیک ہیں۔ پس پہلے پیشانی اٹھانی چاہئے۔ اور قیام کے وقت اپنی نظر کو سجدہ کی جگہ پر اور رکوع کے وقت اپنے پاؤں پر اور سجدے میں ناک کی نوک پر اور جلوس کے وقت اپنے دونوں ہاتھوں پر یا اپنی گود کی طرف نظر رکھنی چاہئے۔ جب نظر پراگندہ ہونے سے روک لی جائے اور مذکورہ بالا جگہوں پر جمالی جائے، تو سمجھ لینا چاہئے کہ نماز بجمعیت اور حضورِ دل کے ساتھ میسر ہو گئی۔

تشریح:

اس (عبارت) میں ایک زبردست نکتہ ہے۔ نماز میں مشغول ہونا چاہئے اور نماز میں جمعیتِ خاطر ہونی چاہئے۔ یہ دونوں باتیں آپ نے بہت زیادہ سنی ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں کیسے حاصل ہوں گی؟

ان (کے حصول) کے لئے حضرت نے فرمایا: جب آپ ان مستحبات میں جو کہ نماز میں continuous (مسلسل) موجود ہیں، مشغول رہیں گے۔ تو یہ نماز ہی میں مشغولی ہے۔ اگر آپ فارغ ہوں گے، تو کبھی کچھ سوچیں گے، کبھی کچھ سوچیں گے۔ لیکن جب آپ ان تمام مستحبات میں مشغول رہیں گے، جیسے مثال کے طور پر آپ کی نظر سجدے کی جگہ پر ہو اور آپ کا خیال ہو کہ نماز

میں سجدہ کی جگہ پر نظر ہونی چاہئے اور اسی طرح یہ خیال ہو کہ سجدہ کیسا ہونا چاہئے، رکوع کیسا ہونا چاہئے اور قعدہ کس طرح ہونا چاہئے، تو ان تمام چیزوں میں آپ کو مستقل فکر ہے کہ یہ چیز ایسی ہونی چاہئے اور یہ چیز ایسی ہونی چاہئے۔ اس فکر کے ساتھ آپ نماز میں مشغول ہیں یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ نماز ہی میں مشغول ہیں۔

ماشاء اللہ! بذریعہ مستحبات نماز میں مشغولی کا جو طریقہ حضرت مجدد صاحب نے بیان فرما دیا ہے، یہ بہت بڑی بات ہے۔ آپ نماز کے مستحبات میں مشغول ہو جائیں، تو آپ کو نماز کے اندر مشغولی اور جمعیتِ خاطر نصیب ہو جائے گی۔ ماشاء اللہ! یہ بہت پتے کی بات ہے۔

متن:

اور خشوع کے ساتھ ادا ہو گئی، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ اور ایسے ہی رکوع کے وقت دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو کُھلا رکھنا اور سجود کے وقت انگلیوں کا ملانا (سنت ہے)۔

تشریح:

اور نیت میں (تکبیرِ تحریمہ کے وقت بھی انگلیوں کا ملانا)۔ بعض لوگ تو نیت اس طرح کرتے ہیں (کہ ہاتھوں سے کانوں کو پکڑ لیتے ہیں) حالاں کہ اس طرح طریقہ نہیں ہے۔ ہاتھوں کو کانوں کے محاذات تک اٹھانا (سنت) ہے، نہ کہ کانوں کے ساتھ ملانا۔ ہاتھوں کا رخ قبلہ کی طرف ہونا چاہئے۔ اسی طرح سجدے کی حالت میں بھی (انگلیوں کا ملانا سنت ہے) یعنی دوسرے لفظوں میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر قیام سے بالکل سیدھے آپ نیچے کی طرف آجائیں، تو سجدے میں

چلے جائیں (یعنی انگلیوں کو کھولنا نہیں ہے)۔ لیکن رکوع میں چوں کہ گھٹنہ پکڑنا ہوتا ہے، اس لئے انگلیاں کھلی ہوتی ہیں۔

متن:

(رکوع کے وقت) دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو کھلا رکھنا اور سجود کے وقت انگلیوں کا ملانا سنت ہے۔ اس کو بھی مد نظر رکھنا چاہئے۔ انگلیوں کا کھلا رکھنا یا ملانا بے تقریب و بے فائدہ نہیں ہے۔ صاحبِ شرع نے اس میں کئی قسم کے فائدے ملاحظہ کر کے اس پر عمل فرمایا ہے۔ نیز صاحبِ شریعت علیہ الصلوۃ والسلام کی متابعت کے برابر کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یہ سب احکام مفصل اور واضح طور پر کتبِ فقہ میں درج ہیں۔ یہاں بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ علمِ فقہ کے مطابق عمل بجالانے میں ترغیب ہو۔

تشریح:

اس (عبارت) میں حضرت نے ایک باریک نکتہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور وہ اشارہ یہ فرمایا ہے کہ میں نے آپ کو فقہ کی باتیں بتائی ہیں اور فقہی مسائل میں اسی بات پر عمل کرنا چاہئے، جو فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

لہذا اگر کسی بات میں مجدد صاحب کا فقہ میں موجود مسئلے سے اختلاف ہو، تو اس میں مفتٰی بہ قول پر عمل کرنا چاہئے، کیوں کہ یہ فقہ کا مسئلہ ہے۔ طریقت کا مسئلہ نہیں ہے۔

میں آپ کو ایک بہت اہم بات بتاتا ہوں، جس میں ہم سب مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے طریقہ پر عمل نہیں کرتے، بلکہ فقہ کے مفتٰی بہ قول پر عمل کرتے ہیں۔ بہت بڑے بڑے

مجددی حضرات (بھی اس مسئلے میں فقہ پر عمل) کرتے ہیں۔ آپ کو "رفعِ سبابہ" کا مسئلہ یاد ہو گا یعنی تشہد میں انگلی اٹھانا! حضرت مجدد صاحب رحمہ اللہ تشہد میں بالکل انگلی اٹھانے کا قائل ہی نہیں ہیں، لیکن اس مسئلے میں ہم حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ والا طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ ایک بہت بڑے مجددی بزرگ گزرے ہیں یعنی "حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ"۔ یہ "قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ" کے شیخ تھے، بہت بڑے آدمی تھے۔ "تفسیرِ مظہری" کے مصنف قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ کے شیخ تھے۔ اسی لئے (مصنف نے) اس تفسیر کا نام "تفسیرِ مظہری" اپنے شیخ کے نام پر رکھا ہے۔ ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرح "رفعِ سبابہ" کیوں نہیں کرتے؟ انہوں نے فرمایا: مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو وہ حدیثیں نہیں پہنچی تھیں، جو ہم تک پہنچی ہیں۔ اگر حضرت کو پہنچی ہوتیں تو حضرت اپنی بات سے رجوع فرماتے۔

اب دیکھئے! ہمارے دیوبند کے تقریباً سب بزرگ طریقت میں مجددی ترتیب پر ہیں، کیوں کہ یا تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے طریقے پر ہیں یا پھر نقشبندی سلسلے کے طریقے پر ہیں۔ ہر طرح سے تقریباً مجددی طریقے سے جا ملتے ہیں۔ لیکن اس "رفع سبابہ" کے مسئلہ میں ہمارا فتویٰ اس چیز پر نہیں ہے، جس پر حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ عمل کرتے تھے۔

حضرت بالکل درمیان درمیان میں ایسی باریک باریک باتیں فرما دیتے ہیں۔ اس لئے فرمایا: "یہ سب احکام مفصل اور واضح طور پر کتب فقہ میں درج ہیں۔ یہاں بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ علمِ فقہ کے مطابق عمل بجالانے میں ترغیب ہو"۔

اس عبارت میں حضرت مجدد صاحب نے آپ کو یہ اشارہ دے دیا ہے کہ فقہ کی کتابوں کے مطابق جو مسئلہ ہو، اس پر عمل کرو۔ مثلاً: اگر مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شافعی ہوتے، تو کیا ہم ان کی طرح نماز پڑھتے؟ خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ شافعی المسلک تھے، تو کیا جتنے چشتی ہیں، وہ سارے شافعی مسلک والے ہو جائیں؟ ہمارے ہندوستان میں تو کوئی بھی چشتی شافعی مسلک کا نہیں ہے۔

لہٰذا فقہی تحقیق اپنے انداز میں ہے۔ اس میں آپ تصوف کو نہیں لائیں گے، بلکہ تصوف میں فقہ کو لائیں گے۔ اس لئے بنیادی بات یہ ہے کہ ہر چیز آپ کو اس کے ماہرین سے لینا ہو گی۔ فقہ کا مسئلہ آپ فقہ کے ماہرین سے لیں گے اور طریقت کا مسئلہ طریقت کے ماہرین سے۔

اصل میں یہ بہت اہم بات ہے کہ طریقت میں آپ کسی سے علمی کمال نہ مانگیں۔ بہت سارے مشائخ جو بالکل اَن پڑھ تھے، لیکن وہ بڑے بڑے حضرات کے مشائخ تھے۔

حضرت عبد العزیز دباغ رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید بڑے محدث تھے۔ خود "حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ" جن کے نام پر ہمارا یہ درس نظامی ہے، لیکن ان کے شیخ بالکل ان پڑھ تھے۔ حضرت نظام الدین رحمہ اللہ نے پانچ سو کے لگ بھگ علماء کو جمع کر کے یہ درس نظامی بنایا تھا۔ ان علماء نے اعتراض کیا کہ آپ کے شیخ عالم نہیں ہیں۔ ان کو اس کی وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔ انہوں نے اپنے شیخ سے اس کا ذکر کیا اور درخواست کی کہ حضرت! اگر آپ ان کے سامنے وعظ کر لیں تو یہ مطمئن ہو جائیں گے، کیوں کہ یہ مجھے تنگ کر رہے ہیں۔ حضرت نے دو رکعت نماز پڑھی اور رو کر دعا کی کہ اے اللہ! ایک بہت بڑے عالم کی عزت کا مسئلہ ہے۔ اپنی عزت کا نہیں

کہا، بلکہ کہا کہ ایک بہت بڑے عالم کی عزت کا مسئلہ ہے۔ یا اللہ! مدد فرمادے۔ اس کے بعد جب بیان کے لئے بیٹھے، تو سبحان اللہ! ایسے علوم کے دریا بہا دیئے کہ وہ علماء پہلے تو دور دور بیٹھے ہوئے تھے یعنی سمجھتے تھے کہ یہ تو اَن پڑھ ہے، یہ کیا بیان کرے گا، لیکن حضرت نے جب علوم کے دریا بہائے تو پھر وہ قریب آ گئے۔ اخیر میں حضرت نے کہا: خدا کے بندو! تم نے چھوٹے چھوٹے حروف میں علم پڑھا ہے۔ ہمیں اللہ پاک نے اتنے موٹے موٹے حروف کے ساتھ علم پڑھایا ہے یعنی علمِ لَدُنّی کی طرف اشارہ کیا۔ اگر اللہ پاک کسی پر یہ علم کھول دے، تو کوئی کیا کہہ سکتا ہے! اللہ کا فضل ہے۔

اس لئے ہمیں کبھی بھی مشائخ سے فقہ کی مہارت کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے۔ صرف فرضِ عین درجہ کا علم کافی ہے، کیوں کہ یہ علم سب پر فرض ہے۔ اسے جاننا ہر ایک پر لازم ہے۔ لیکن فرضِ کفایہ درجہ کا جو علم ہے، وہ ان سے طلب نہیں کریں گے۔

کسی مفتی سے اگر وہ شیخ نہ ہو، آپ اپنی تربیت نہیں کروائیں گے۔ اور شیخ سے اگر وہ مفتی نہ ہو، آپ فتویٰ نہیں پوچھیں گے۔

گڑبڑ خود لوگوں میں ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ پریشانی اٹھاتے ہیں۔ طریقہ یہ ہے کہ مفتی سے اگر وہ شیخ نہیں ہے، تربیت نہ کرواؤ اور شیخ سے اگر وہ مفتی نہیں ہے، فتویٰ طلب نہ کرو۔ "لِكُلِّ فَنٍّ رِجَالٌ" ہر فن کے لئے مخصوص لوگ ہیں۔ اللہ پاک نے جس شخص کو جس فن کے لئے پیدا کیا ہے، اس فن میں اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ اگر کوئی انجینئر ہے، تو اس سے انجینئرنگ میں مدد لو۔ اگر کوئی ڈاکٹر ہے، تو اس سے ڈاکٹری میں فائدہ اٹھاؤ۔ اگر scientist (سائنس دان) ہے،

تو سائنس میں فائدہ اٹھاؤ۔ یہ کیا بات ہوئی کہ آپ انجینئر کے پاس جا کر کہیں کہ میرے سر میں درد ہے، میں کیا کروں؟ وہ کہے گا: اپنے دماغ کا علاج کراو، کیوں کہ میں ڈاکٹر تو نہیں ہوں۔

بہر حال! حضرت نے جو اشارہ دیا ہے، اس اشارے سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

مکتوب نمبر 69 دفتر دوم میں نماز کی ہئیت، حقیقت اور برکات کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

چوں کہ اس زمانے میں اکثر لوگ نماز کی ادائیگی میں سستی کرتے ہیں اور طمانیت اور تعدیلِ ارکان میں کوشش نہیں کرتے (یعنی ہر رکن کو اطمینان کے ساتھ ادا نہیں کرتے)، اس لئے اس بارے میں بڑی تاکید اور مبالغہ کے ساتھ لکھا جاتا ہے، غور سے سنیں۔

مخبر صادق علیہ الصلٰوۃ والسلام نے فرمایا ہے کہ چوروں میں سب سے بڑا چور وہ ہے، جو اپنی نماز میں چوری کرتا ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اپنی نماز سے کوئی کس طرح چُراتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نماز میں چوری یہ ہے کہ وہ نماز کے رکوع، سجود کو اچھی طرح ادا نہیں کرتا۔ (**صحیح ابنِ حبان، حدیث نمبر:1888**) نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خدائے جل شانہ اس شخص کی نماز کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا، جو رکوع و سجود میں اپنی پیٹھ کو ثابت (سیدھا) نہیں رکھتا۔ (**مشکوۃ المصابیح، حدیث نمبر:904**) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا کہ رکوع و سجود پوری طرح ادا نہیں کر رہا تو آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا: تو اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتا؟ اگر تو اسی عادت پر مرا تو دینِ محمدی پر تیری موت نہیں ہوگی۔(**صحیح بخاری، حدیث نمبر:791**)

تشریح:

میں بہت حیران ہو جاتا ہوں۔ اللہ معاف فرمائے۔ مستحبات میں تو انسان کو ملامت نہیں کرنی چاہئے، کیوں کہ اس میں ہمیں ملامت کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن واجبات میں تو بہت خیال رکھنا چاہئے۔ نماز میں قومہ اور جلسہ کے دوران سیدھا ہونا واجب ہے۔ بے شک تھوڑی دیر کے لئے ہی ہو، لیکن اتنا سیدھا ہونا کہ کم از کم ہڈیاں اپنی جگہ پر آجائیں، واجب ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بہت سارے لوگ نماز پڑھتے ہیں، لیکن ابھی تھوڑے سے اٹھے ہوتے ہیں کہ دوبارہ سجدہ کر لیتے ہیں اور رکوع کی حالت میں بھی اسی طرح کرتے ہیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے باقاعدہ کپڑے بھی سمیٹ لیتے ہیں۔ یہ نماز کے ساتھ کھیل ہے۔ نماز کو خراب کر رہے ہیں۔ ایسے حضرات کو نرمی سے سمجھانا چاہئے۔

حضرت تنظیم الحق حلیمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو خود پٹھانوں کی طرح نماز تیز پڑھتے تھے۔ پٹھانوں کا اپنا ایک سٹائل ہے وہ اس سٹائل سے نماز پڑھتے تھے، لیکن قومہ اور جلسہ میں جو ضروری درجہ ہے، اسے تو وہ پورا کرتے تھے، کیوں کہ نماز تو وہ صحیح پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حج کے موقع پر ایک افغانی نماز پڑھ رہے تھے اور اسی طرح پڑھ رہے تھے، جس طرح میں نے کہا کہ بس تھوڑا سا اوپر اور پھر نیچے۔ رکوع کی حالت میں بھی وہ اسی طرح جلدی کر رہے تھے۔ جب افغانی نے نماز پڑھ لی، تو حضرت نے ان کے سامنے جھولی پھیلائی اور کہا: میں تیرے سامنے

جھولی پھیلاتا ہوں، خدا کے لئے بس فرض نماز، واجب نماز اور سنتِ مؤکدہ پڑھو، مگر نفل نہ پڑھو۔ اس نے کہا: وہ کیوں؟ انہوں نے کہا: اس لئے کہ تم قرض دار بن رہے ہو۔ فرض نماز تو جیسے بھی ہو، آپ نے پڑھنی ہی ہے، کیوں کہ وہ وقت کے مطابق فرض ہے۔ اس میں تو اللہ تعالی آپ کے ساتھ جو معاملہ کرے گا، وہ ایک الگ بات ہے۔ سنت مؤکدہ اور واجب نماز بھی پڑھو، لیکن نفل نماز اگر تم غلط پڑھ رہے ہو تو تمہارے اوپر وبال جمع ہو رہا ہے۔ غلط نماز پڑھ کے تم اپنے اوپر وبال جمع کر رہے ہو، اس لئے خدا کے لئے نفل نہ پڑھو، ورنہ دنیا سے قرض دار جاؤ گے۔

یہ بات بالکل صحیح ہے۔ دیکھیں! اگر وقت نہیں ہے، تو مغرب کے وقت صرف دو رکعت سنتیں پڑھ لو اور نماز پوری کر لو۔ اگر لمبی دعا نہیں کر سکتے، وقت نہیں ہے، تو مختصر دعا کر لو۔ **"اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً"** اتنی دعا بھی کافی ہے، یہی ایک دعا کر لو، لیکن دل سے کرو۔ ایسا نہ کرو کہ جیسے کسی نے کوئی چیز یاد کی ہوتی ہے اور پانچ منٹ دس منٹ جتنا ٹائم ہوتا ہے، اس میں بالکل فر فر پڑھ رہا ہوتا ہے اور یہ ہوش نہیں ہوتا کہ میں کدھر ہوں، دل نہیں لگ رہا ہوتا۔ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اس طرح نماز اور دعا کے ساتھ غفلت اور عجلت کا معاملہ نہیں کرنا چاہئے، کیوں کہ نماز اور دعا کرنا اللہ پاک کا حکم ہے۔

متن:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کی نماز اس وقت تک کامل نہیں، جب تک کہ رکوع کے بعد پوری طرح کھڑا نہ ہو اور اپنی پیٹھ کو سیدھا نہ کر لے اور اس کا ہر ایک عضو اپنی جگہ قرار نہ پکڑ لے۔ **(الترغیب والترھیب، حدیث نمبر: 763)** اور اسی طرح آپ صلی اللہ

علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے کے وقت اپنی پشت کو سیدھا نہیں کرتا، اس کی نماز کامل نہیں ہوتی۔ **(الترغیب والترھیب، حدیث نمبر: 763)** آپ صلی اللہ علیہ و سلم ایک نمازی کے پاس سے گزرے، دیکھا کہ وہ احکام وارکان، قومہ وجلسہ پوری طرح ادا نہیں کررہا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: اگر تو اسی عادت پر مر گیا، تو قیامت کے دن تجھ کو میری امت سے نہیں کہا جائے گا۔ اور دوسری جگہ (ہے کہ) آپ نے فرمایا: اگر تو اسی عادت پر مر گیا تو دینِ محمدی پر نہیں مرے گا۔ **(صحیح بخاری، حدیث نمبر: 791)**

تشریح:

کیا اس (تعدیلِ ارکان) کے واجب ہونے کے لئے یہ دلیل کافی نہیں ہے؟

متن:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ کوئی شخص ایسا ہوتا ہے کہ ساٹھ سال تک نماز پڑھتا رہے اور اس کی ایک نماز بھی قبول نہیں ہوتی، کیوں کہ اس شخص نے رکوع وسجود کو بخوبی ادا نہیں کیا ہوتا۔ **(الترغیب والترھیب، حدیث نمبر: 753)** کہتے ہیں کہ زید بن وہب رحمہ اللہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ نماز پڑھ رہا ہے اور رکوع وسجود پوری طرح ادا نہیں کررہا تو آپ نے اس شخص کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ کب سے تو اس طرح کی نماز پڑھ رہا ہے؟ اس نے کہا: چالیس سال سے۔ آپ نے فرمایا: اس چالیس کے عرصے میں تیری ایک نماز بھی نہیں ہوئی۔ اگر تو مر گیا تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر نہیں مرے گا۔ **(سنن النسائی، حدیث نمبر: 1312)** (اللہ ہمیں بچائے) منقول ہے کہ جب مومن بندہ نماز اچھی طرح ادا کرتا ہے اور اس

کے رکوع و سجود بخوبی بجالاتا ہے، تو اس کی نماز بشاشت والی اور نورانی ہوتی ہے، فرشتے اس نماز کو آسمان پر لے جاتے ہیں اور وہ نماز اپنے نمازی کے لئے اچھی دعا کرتی ہے اور کہتی ہے: ''حَفِظَکَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ کَمَا حَفِظْتَنِیْ''۔ یعنی خدائے عزوجل تیری حفاظت کرے، جس طرح تو نے میری حفاظت کی۔ اور اگر وہ نماز کو اچھی طرح ادا نہیں کرتا تو وہ نماز ظلمت والی رہتی ہے، فرشتوں کو اس نماز سے کراہت آتی ہے اور وہ اس نماز کو آسمان پر نہیں لے جاتے اور وہ نماز اس نمازی کے لئے بد دعا کرتی ہے اور کہتی ہے: **''ضَیَّعَکَ اللّٰہُ تَعَالٰی کَمَا ضَیَّعْتَنِیْ''**۔ یعنی خدائے عزوجل تجھ کو ضائع کرے، جس طرح تو نے مجھ کو ضائع کیا۔ **(الترغیب والترھیب للمنذری، باب الترغیب فی الصلوۃ لاول وقتھا، حدیث نمبر:11)**

پس نماز کو عمدہ طریقے پر ادا کرنا چاہئے۔ اور تعدیلِ ارکان یعنی رکوع، سجود، قومہ اور جلسہ اچھی طرح بجالانا چاہئے اور دوسرے لوگوں کو بھی ہدایت کرنی چاہئے کہ وہ نماز کو کامل طور پر ادا کریں اور تعدیلِ ارکان کو طمانیت کے ساتھ ادا کرنے میں کوشش کریں، کیوں کہ اکثر لوگ اس دولت سے محروم ہیں اور یہ عمل متروک ہوتا جارہا ہے۔ اس عمل کا زندہ کرنا بھی دین کی اہم ضروریات میں سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری کسی مُردہ سنت کو زندہ کرتا ہے، اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملتا ہے۔ **(مشکاۃ المصابیح، حدیث نمبر:176)**

اور یہ بھی سمجھ لیں کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے وقت صفوں کو سیدھا اور برابر کرنا چاہئے، تاکہ نمازیوں میں سے کوئی شخص آگے پیچھے کھڑا نہ ہو، کوشش کرنی چاہئے کہ سب نمازی ایک دوسرے کے برابر کھڑے ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہلے صفوں کو درست فرما

کرتے تھے پھر تکبیرِ تحریمہ کہتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صفوں کا برابر کرنا بھی اقامتِ صلوٰۃ میں سے ہے۔ (**صحیح بخاری، حدیث نمبر:723**)

تشریح:

آج کل یہ مسئلہ بھی ہے کہ ائمہ حضرات اپنی duty (ذمہ داری) پوری نہیں کرتے۔ جب تک ان کو اطمینان نہ ہو جائے کہ صفیں صحیح درست ہو گئیں، اس وقت تک ان کو تکبیرِ تحریمہ نہیں کہنی چاہئے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ ایک رواج کے طور پر تو کہہ دیں کہ **"سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ"** یعنی صفوں کو درست کر لو اور بس یہ کہہ کر **"اَللّٰهُ اَكْبَرُ"** کہہ دیں، خواہ صفیں درست ہوئی ہوں یا نہ ہوئی ہوں۔ نہیں، بھائی! صفیں درست کرانا آپ کی ذمہ داری ہے۔ پہلے اس کے لئے باقاعدہ ایک جماعت ہوا کرتی تھی جو صفوں کو درست کرواتی تھی۔ اس لئے احکامات ہیں کہ اپنے مونڈھوں کو relax (نرم) رکھو، تاکہ اگر کوئی آپ کو آگے پیچھے کرے، تو اس میں دقت نہ ہو۔ کم از کم اتنا تو ہونا چاہئے کہ آگے پیچھے دیکھ لیا جائے کہ سب لوگ صفیں درست کر چکے ہیں یا نہیں۔ اس میں بمشکل دو منٹ لگ جائیں گے، لیکن آپ کم از کم اپنی ذمہ داری تو پوری کر لیں گے۔ صرف یہ کہنا کہ "صفیں درست کر لو" کافی نہیں ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے صفیں درست کرنے کا ٹائم تو دیا نہیں۔

بعض لوگ تو یہاں تک کرتے ہیں کہ اقامت کے دوران بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کو فقہی مسئلہ کا پتہ ہوتا ہے کہ **"قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ"** پر کھڑا ہونا ہے۔ وہ اسی وقت کھڑے ہوتے ہیں۔

تو "قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ" اور "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" میں کتنا وقت ہوتا ہے؟ ایک منٹ بھی نہیں ہوتا۔ کیا اس دوران صفیں درست ہو سکتی ہیں؟ اس وقت میں تو صفیں درست نہیں ہو سکتیں۔ اگر آپ "قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ" پر ہی کھڑا ہونا چاہتے ہیں، تو پہلے سے صفیں سیدھی کر کے بیٹھیں، تاکہ جیسے ہی آپ کھڑے ہوں تو صفیں پہلے سے ہی درست ہوں۔ یہ بھی ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ جب کھڑے ہو جائیں، تو پھر دیکھیں کہ صفیں آگے پیچھے تو نہیں ہیں۔ اس وقت صفوں کو درست کر لیں، ورنہ پھر "سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ" والا حکم پورا نہیں ہو گا۔ جس میں آپ خود ہی اعلان کرتے ہیں کہ صفوں کی درستگی کا اہتمام نماز کا حصہ ہے اور پھر خود ہی آپ نے اس کا حق ادا نہیں کیا۔

مکتوب نمبر 261 دفتر اول میں اس بارے میں کہ "نماز مؤمن کی معراج ہے" ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

حمد و صلوٰۃ اور تبلیغِ دعوات کے بعد میرے عزیز بھائی کو معلوم ہو کہ اسلام کے پنجگانہ ارکان میں سے "نماز" رکنِ دوم ہے۔ جو تمام عبادات کی جامع ہے اور ایک ایسا جزو ہے کہ جس نے اپنی جامعیت کی وجہ سے کُل کا حکم پیدا کر لیا ہے اور تمام مقرب اعمال پر سبقت لے گئی ہے اور وہ دولتِ رؤیتِ باری تعالیٰ جو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج بہشت میں میسر ہوئی تھی، دنیا میں نزول فرمانے کے بعد اس جہان کے مناسب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ دولت نماز

میں میسر ہوتی تھی۔ اسی لئے آنحضرت نے فرمایا: ”بندے کو اپنے رب کے ساتھ سب سے زیادہ قرب نماز میں ہوتا ہے“۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل تابعداروں کو بھی اس جہاں میں اس دولت کا بہت سا حصہ نماز میں ملتا ہے۔ اگرچہ حقیقی رؤیت میسر نہیں ہے، کیوں کہ یہ جہان اس کی تاب و طاقت نہیں رکھتا۔ اگر حق تعالیٰ نماز کا حکم نہ فرماتا تو مقصود کے چہرے سے نقاب کون اٹھاتا؟ اور طالب کو مطلوب کی طرف کون رہنمائی کرتا؟ نماز ہی ہے، جو غم گساروں کے لئے لذت بخش ہے اور نماز ہی ہے، جو بیماروں کو راحت دیتی ہے۔ **”أَرِحْنِيْ يَا بِلَالُ!“** (اے بلال! مجھے راحت دے) اس حقیقت کا رمز ہے اور **”قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ“** (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) میں اسی آرزو کی طرف اشارہ ہے۔ وہ ذوق و مواجید، علوم و معارف، احوال و مقامات، انوار و الوان، تلوینات و تمکینات، بیقراری و اطمینان، تجلیاتِ متکیّفہ (کیفیت والی تجلیات) اور بے کیفیت والی تجلیات اور ظہوراتِ متلوّنہ وغیرہ (رنگارنگ و بے رنگ ظہورات)، ان میں سے جو کچھ نماز کے علاوہ اوقات میں میسر ہوں اور نماز کی حقیقت سے آگاہی کے بغیر ظاہر ہوں، ان سب کا منشاء ظلال و امثال ہے، بلکہ وہم و خیال سے پیدا ہوئے ہیں۔

تشریح:

حضرت نے کیسی واضح بات کی ہے اور حضرت ایسا کرتے رہتے ہیں۔

یعنی اصل چیز یہ نہیں ہے کہ تم تصورات میں کہاں سے کہاں پہنچ جاؤ۔ وہ تصورات اس لئے ہیں کہ تم صحیح جگہ پر آجاؤ۔ اور صحیح جگہ یہ ہے کہ تمہاری نماز درست ہو جائے، تمہارا روزہ درست ہو جائے، تمہاری زکوۃ درست ہو جائے، تمہارا حج درست ہو جائے، تمہارے معاملات

درست ہو جائیں، تمہاری معاشرت درست ہو جائے۔ تصورات اِن چیزوں کے لئے ہیں، یہ چیزیں تصورات کے لئے نہیں ہیں۔

یہ بنیادی بات ہے، جس پر مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت زور دیتے ہیں اور میرے خیال میں آج کل مجددی حضرات میں ہی اس کی زیادہ کمی ہے۔ وہ معارف کا زیادہ تذکرہ کرتے رہتے ہیں، لیکن اس بات کی طرف بہت کم دھیان دیتے ہیں، حالاں کہ یہ اصل ہے۔

متن:

جو نماز کی حقیقت سے آگاہ ہیں، نماز کی ادائیگی کے وقت گویا عالمِ دنیا سے باہر نکل جاتے ہیں اور عالمِ آخرت میں پہنچ جاتے ہیں، لہٰذا وہ اُس وقت اُس دولت سے، جو آخرت کے ساتھ مخصوص ہے، حصہ حاصل کر لیتے ہیں اور اصل سے ظلیت کی آمیزش کے بغیر فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ کیوں کہ عالمِ دنیا کا معاملہ کمالاتِ ظلی تک محدود ہے اور وہ معاملہ، جو ظلال سے باہر ہے، (وہ) آخرت کے ساتھ مخصوص ہے۔

تشریح:

الحمد للہ! اللہ پاک نے اس وقت عجیب علم عطا فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت نے فرمایا: نماز آپ کو اصل تک پہنچاتی ہے اور اصل اس دنیا میں نہیں ہے۔ یہ کائنات تو ظل ہے۔ اصل وہاں ہے۔ نماز آپ کو اصل میں اُدھر پہنچاتی ہے۔ جیسے آپ نے تکبیرِ تحریمہ کہی تو آپ اُدھر پہنچ گئے۔ اب آپ اُدھر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نمازی کے سامنے سے گزرنا منع ہے۔

یہ ساری باتیں جو حضرت نے فرمائی ہیں کہ نماز کے اندر جو معاملہ ہے، وہ آخرت کا ہے۔ ہم جتنی دیر نماز میں ہیں، گویا ہم عالمِ آخرت میں ہیں۔ "**مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا**" یعنی مر جاؤ اس سے پہلے کہ تم مر جاؤ۔ نماز کے ذریعے آپ پانچ وقت اِس دنیا سے اُس دنیا میں جاتے ہیں۔

جیسا کہ فرمایا گیا ہے کہ اگر پانچ نہریں کسی کے راستے میں ہوں تو کیا اس پر کوئی میل کچیل باقی رہ جائے گا؟

متن:

پس معراج سے چارہ نہیں ہو گا اور وہ مومنوں کے حق میں نماز ہے۔ اور یہ دولت اس امت کے ساتھ مخصوص ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت کے سبب، جو شبِ معراج میں دنیا سے آخرت میں تشریف لے گئے اور بہشت میں پہنچ کر حق تعالیٰ کی رؤیت کی دولت سے مشرف ہوئے۔ لہٰذا یہ امت بھی اس کمال کے ساتھ مشرف اور اس سعادت سے فیض یاب ہوئی۔

تشریح:

چوں کہ یہ تحفہ بھی معراج میں ملا ہے۔ در اصل پچاس نمازیں فرض ہوئی تھیں یعنی ہماری اس دنیا کا زیادہ سے زیادہ حصہ اللہ تعالیٰ وہاں کا بنانا چاہتے تھے، لیکن موسیٰ علیہ السلام کو چوں کہ اپنی قوم سے بڑا تجربہ ہو چکا تھا، اس لئے بار بار آپ ﷺ سے عرض کرتے کہ حضرت! آپ تھوڑا سا اور بھی اللہ پاک سے مانگیں کہ کچھ مزید نمازیں کم ہو جائیں۔ میری امت تین نمازیں نہیں پڑھ سکی تو آپ کی امت کے لوگ اتنی نمازیں کیسے پڑھیں گے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار

جاتے رہے۔ آخر میں جب پانچ نمازیں لے کر آئے تو رک گئے کہ اب مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ مزید کچھ کہہ سکوں۔ اس لئے پانچ فرض ہوئیں۔ پھر اللہ کی طرف سے فضل یہ ہوا کہ ہیں تو پانچ نمازیں، لیکن ثواب پچاس کا ہو گا۔

نوافل کے بارے میں مکتوب نمبر 242 میں ارشاد فرماتے ہیں:

(حضرت کا مکتوب پڑھنے سے پہلے) یہاں پر میں حضرت کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا نکتہ عرض کرنا چاہوں گا۔

وہ یہ کہ حضرت کے دور میں جو کچھ لوگوں میں ہو رہا تھا، حضرت نے ان چیزوں کی اصلاح فرمائی ہے۔ اس لئے بعض چیزیں جو اس وقت بگڑی ہوئی تھیں، اب بگڑی ہوئی نہیں ہیں، ان کے لئے وہ باتیں valid (درست) نہیں ہوں گی۔ اور جو چیزیں اُس وقت بگڑی ہوئی نہیں تھیں، اب بگڑ گئی ہیں، ان کے لئے ہمیں اپنے طور پر آج کل کے دور کے لحاظ سے سوچنا پڑے گا۔

اُس وقت لوگ نوافل پڑھتے تھے۔ اب تو لوگ سنتیں بھی نہیں پڑھتے۔ اب تو اور مصیبتیں آ گئیں۔ بہت سارے علاقوں میں لوگ سنتیں بھی گول کر لیتے ہیں۔ تو وہ دور ایسا تھا کہ لوگ نوافل پڑھتے تھے، نفلوں کا اہتمام زیادہ تھا۔ اس لئے یہاں اُن باتوں کا ذکر آئے گا جن کی تصحیح حضرت نے اُس وقت کے لحاظ سے فرمائی تھی. لیکن ہمیں آج کل کے وقت کے لحاظ سے کچھ باتوں کو سمجھنا پڑے گا۔ اسی لئے میں نے حضرت کے مکتوبات شریفہ سے چُن چُن کر چیزیں لی ہیں، تاکہ ایسا نہ ہو کہ لوگ نفلوں کے دشمن ہو جائیں اور جو آج کل تھوڑی بہت سعادت مل رہی ہے، کہیں یہ بھی ہاتھ سے نہ چلی جائے۔

نوافل کے بارے میں مکتوب نمبر 242 میں ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بعض اوقات اسمِ ذات عزوجل کا ذکر زیادہ نفع بخش ہے اور بعض دوسرے اوقات میں ذکرِ نفی و اثبات انسب ہے۔ باقی رہا باطن کا معاملہ؛ تو وہاں بھی جب تک غفلت بالکل دُور نہ ہو جائے، ذکر کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ البتہ اس قدر ہے کہ ابتداء میں یہ دو ذکر متعین ضروری ہیں اور وسط و انتہاء میں یہ دونوں ذکر متعین نہیں ہیں۔ اگر تلاوتِ قرآن مجید اور نماز کی ادائیگی سے غفلت دُور ہو جائے، تو گنجائش ہے۔ لیکن قرآن مجید کی تلاوت متوسط حال والوں کے مناسب ہے اور نمازِ نوافل کی ادائیگی منتہی حال والوں کے مناسب ہے۔

تشریح:

یعنی نوافل کے بارے میں بتادیا کہ منتہی لوگوں کو نوافل کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہئے۔

اسی کے بارے میں مکتوب نمبر 260 میں اس کی حقیقت بیان فرماتے ہیں:

متن:

اور اسی طرح نوافل کی ادائیگی من جملہ ظلال کے ایک ظل سے قریب کر دیتی ہے اور اصل سے قرب فرائض کی ادائیگی میں ہے، جس میں ظلیت کی آمیزش نہیں ہے۔ مگر وہ نوافل جو فرائض کی تکمیل کے لئے ادا کئے جائیں، وہ بھی قربِ اصل کے لئے مُمِد و معاون اور فرض کے ملحقات سے ہیں۔ لہٰذا لازمی طور پر فرائض کی ادائیگی کا تعلق عالمِ خلق کے مناسب ہے. جو اصل کے ساتھ متوجہ ہے اور نوافل کی ادائیگی عالمِ امر کے مناسب ہے. جس کا چہرہ ظل کی طرف ہے۔

تمام فرائض اگرچہ اصل کی طرف قرب بخشتے ہیں، لیکن ان میں سب سے افضل و اکمل صلوۃ (نماز) ہے۔ "اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِ" (نماز مومن کے لئے معراج ہے)۔ اور "اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الْعَبْدُ مِنَ الرَّبِّ فِی الصَّلٰوۃِ" (بندے کو سب سے زیادہ قرب پروردگار سے نماز میں ہوتا ہے)، تم نے سنا ہو گا۔

اب نوافل کی سردار نمازِ تہجد کے بارے میں مکتوب 31 میں ہدایت فرماتے ہیں:

متن:

پانچوں وقت کی نماز جمعیتِ قلب کے ساتھ باجماعت اور تعدیلِ ارکان کے ساتھ ادا کریں اور نمازِ تہجد کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ صبح کے وقت استغفار کو بھی نہ چھوڑیں اور خوابِ خرگوش سے لذت حاصل نہ کریں۔

اسی کے بارے میں مکتوب نمبر 69 دفتر دوم میں مزید زیادہ زور دیتے ہیں:

متن:

دوسری نصیحت جو دوستوں کے لئے کی جاتی ہے، وہ نمازِ تہجد کو اپنے اوپر لازم کرنا ہے۔ جو طریقے کی ضروریات میں سے ہے۔ یہ بات بالمشافہ بھی آپ سے کہی گئی تھی۔ اگر یہ چیز دشوار ہو اور بیدار ہونا خلافِ عادت میسر نہ ہو، تو اپنے متعلقین کی ایک جماعت کو اس کام کے لئے مقرر کر دیں، تاکہ وہ وقت پر آپ کو طوعاً و کرھاً بیدار کر دیں اور آپ کو خوابِ غفلت میں نہ پڑا رہنے دیں۔ جب چند روز ایسا کریں گے تو امید ہے کہ اس دولت پر بے تکلف مداومت میسر ہو جائے گی۔

تشریح:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور formula (فارمولا) ہے کہ پہلے تکلف کے ساتھ کام کرو، پھر بعد میں عادت ہو جائے گی، پھر اس سے بڑھ کر عبادت ہو جائے گی۔

مکتوب نمبر 260 میں فرائض کے مقابلے میں نوافل کے حکم کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

وضاحت: اس مکتوب میں حضرت اپنے دور کی بات کر رہے ہیں۔

متن:

اور اس میں شک نہیں ہے کہ نفل کی فرض کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔ کاش! اس کو دریائے محیط کے مقابلے میں قطرہ ہی کی نسبت ہوتی، بلکہ سنت کے مقابلے میں بھی نفل کی یہی نسبت ہے، اگرچہ سنت اور فرض کے درمیان بھی قطرہ اور دریا کی نسبت ہے۔ لہٰذا دونوں قربوں (قرب بالنوافل اور قرب بالفرائض) کے درمیانی فرق کو اسی پر قیاس کر لینا چاہئے۔ اور عالمِ خلق کا شرف عالمِ امر پر اسی فرق سے سمجھ لینا چاہئے۔

تشریح:

یہ آج کل بھی بڑا مسئلہ ہے کہ لوگ نوافل سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور نوافل پڑھنے والے کو بزرگ سمجھتے ہیں۔ یعنی اگر آپ تہجد پڑھتے ہیں، اوابین وغیرہ پڑھتے ہیں اور ذکر و تسبیحات کرتے ہیں، تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ بڑا بزرگ ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ معاملات میں جو گڑبڑ

کرتے ہیں، اس کی طرف لوگ دھیان نہیں دیتے، حالاں کہ وہ فرض ہے۔ حرام سے بچنا فرض ہے یا نہیں؟

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص فرائض پورے نہ کرے اور نوافل پڑھتا رہے، تو آپ اس کو کیا کہیں گے؟ ظاہر ہے کہ جاھل کہیں گے، بے وقوف کہیں گے، کیوں کہ فرائض کا حق نوافل کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

متن:

اکثر لوگ جو اس معنی سے بے نصیب ہیں، اپنے فرائض کو خراب کر کے نوافل کی ترویج میں کوشش کرتے ہیں۔ صوفیائے خام ذکر اور فکر کو اہم ترین ضروریات جان کر فرائض اور سنتوں کی بجا آوری میں سُستی کرتے ہیں اور چلّوں اور ریاضتوں کو اختیار کر کے جمعہ اور جماعت کو ترک کر دیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ایک فرض کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا ان کے ہزاروں چلّوں سے بہتر ہے۔ ہاں آدابِ شرعیہ کی رعایت کے ساتھ ذکر و فکر میں مشغول ہونا بہت بہتر اور اہم ترین کام ہے۔ اور علماء بے سر انجام بھی نوافل کو رواج دینے میں کوشش کرتے ہیں اور فرائض کو خراب و ابتر کرتے ہیں۔

تشریح:

چوں کہ حضرت عالم بھی ہیں اور صوفی بھی ہیں، اس لئے علماء کی اصلاح بھی فرما رہے ہیں۔

متن:

مثلاً نمازِ عاشورہ کو جو حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے صحت کے ساتھ نہیں پہنچی، جماعت اور تمام جہت کے ساتھ اہتمام سے ادا کرتے ہیں، حالاں کہ جانتے ہیں کہ فقہ کی روایات نمازِ نفل باجماعت کی کراہت پر ناطق ہیں اور فرض کی ادائیگی میں سستی برتتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں کہ فرض نماز کو مستحب وقت میں ادا کریں، بلکہ اصل وقت سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں اور نماز باجماعت کا بھی زیادہ اہتمام نہیں کرتے۔ ایک یا دو آدمیوں کی جماعت پر قناعت کر لیتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات تنہا پڑھ لینے پر ہی کفایت کرتے ہیں۔ جب اسلام کے پیشواؤں کا یہ حال ہو تو عوام کے بارے میں کیا کہا جائے! اس عمل کی نحوست کی وجہ سے اسلام میں ضعف پیدا ہو گیا اور اس فعل کی ظلمت کی وجہ سے ہوا و ہوس اور بدعت عام ہو گئی۔

اندکے پیش تو گفتم غمِ دل ترسیدم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ترجمہ: ”غمِ دل مختصر ہی کہتا ہوں دکھ نہ پہنچائے میری بات طویل“۔

مکتوب نمبر 288 میں نفل نماز کی جماعت کی کراہت کو یوں واضح فرماتے ہیں:

متن:

جاننا چاہئے کہ اس زمانے میں اکثر خواص و عوام نوافل کے ادا کرنے میں تو بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور فرض نمازوں میں سستی کرتے ہیں اور ان فرائض میں سنن و مستحبات کی رعایت بھی بہت کم کرتے ہیں۔ نوافل کو عزیز جانتے ہیں اور فرائض کو ذلیل و خوار۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو فرائض کو مستحب وقتوں میں ادا کرتے ہوں۔ جماعتِ مسنونہ کی تکثیر (کثرت) میں،

بلکہ نفسِ جماعت کی بھی کوئی پابندی نہیں کرتے اور نفسِ فرائض کو غفلت و سستی کے ساتھ ادا کرنے کو غنیمت جانتے ہیں، لیکن عاشوراء (دسویں محرم) کے دن اور شبِ برأت اور ماہِ رجب کی ستائیسویں شب اور ماہِ مذکور (رجب) کے اول جمعہ کی شب کو جس کا نام انہوں نے لیلۃ الرغائب (ماہ رجب کی پہلی شب جمعہ) رکھا ہے، نہایت اہتمام کر کے نوافل کو بہت بڑی جمعیت کے ساتھ با جماعت ادا کرتے ہیں اور اس کو نیک و مستحسن خیال کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ نوافل کو اہتمام کے ساتھ با جماعت ادا کرنا شیطان کا مکر و فریب ہے، جو کہ سیئات کو حسنات کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ جیسا کہ:

1۔ شیخ الاسلام مولانا عصام الدین ہروی شرح وقایہ کے حاشیہ میں فرماتے ہیں کہ نوافل کو باجماعت ادا کرنا اور فرضوں کی جماعت کو ترک کرنا شیطان کا مکر و فریب ہے۔

2۔ جاننا چاہئے کہ نوافل کو کامل جمعیت اور جماعت کے ساتھ ادا کرنا مذمومہ و مکروہہ بدعتوں میں سے ہے اور ان بدعتوں میں سے ہے، جن کے متعلق حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”مَنْ اَحْدَثَ فِیْ دِیْنِنَا هٰذَا فَهُوَ رَدٌّ“۔

ترجمہ: ”جس کسی نے ہمارے اس دین میں نئی بات نکالی، تو وہ مردود ہے“۔

3۔ جاننا چاہئے کہ نوافل کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا بعض فقہی روایتوں کی رو سے مطلق طور پر مکروہ ہے اور دوسری روایات میں کراہت کو تداعی و تجمیع (یعنی اعلان و اجتماع) کے ساتھ مشروط کہا گیا ہے۔ اگر تداعی کے بغیر ایک دو آدمی مسجد کے گوشہ میں نفل نماز جماعت سے ادا کریں، تو یہ بغیر کراہت کے جائز ہے۔ تین آدمیوں کی جماعت میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ اور بعض روایات

میں (ہے کہ) چار آدمیوں کی جماعت بالاتفاق مکروہ ہے اور بعض دوسری روایات میں (ہے کہ) اصح یہ ہے کہ مکروہ ہے۔

4۔ فتاویٰ سراجیہ میں ہے کہ تراویح اور کسوف (سورج گرہن) کی نماز کے علاوہ دیگر نوافل کو باجماعت ادا کرنا مکروہ ہے۔

5۔ اور فتاویٰ غیاثیہ میں (ہے کہ) شیخ الامام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رمضان کے علاوہ نمازِ نوافل کو جماعت سے ادا کرنا جب کہ تداعی (اعلان) کے طریق پر ہو، مکروہ ہے۔ لیکن جب ایک یا دو آدمی اقتدا کریں، تو مکروہ نہیں۔ اور تین میں اختلاف ہے اور چار میں بلا خلاف مکروہ ہے۔

6۔ اور فقہ کی مشہور کتاب خلاصہ میں ہے کہ نفلوں کی جماعت جب تداعی کے طریق پر ہو، تو مکروہ ہے۔ لیکن اگر اذان و اقامت کے بغیر گوشہ مسجد میں ادا کی جائے، تو مکروہ نہیں۔

7۔ اور شمس الائمہ حلوانی نے کہا ہے کہ جب امام کے علاوہ تین آدمی ہوں، تو بالاتفاق مکروہ نہیں اور چار میں اختلاف ہے اور اصح یہی ہے کہ مکروہ ہے۔ اور فتاویٰ شافیہ میں ہے کہ ماہِ رمضان کے علاوہ نوافل کو جماعت سے ادا نہ کریں اور نوافل کو تداعی کے طور پر یعنی اذان اور اقامت کے ساتھ ادا کرنا مکروہ ہے، لیکن ایک یا دو آدمی اقتدا کر لیں جو تداعی کے طور پر نہ ہوں، تو مکروہ نہیں اور اگر تین (آدمی) اقتدا کریں تو اس میں مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ کا اختلاف ہے اور اگر چار آدمی اقتدا کریں تو بالاتفاق مکروہ ہے۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی روایتیں ہیں اور فقہ کی کتابیں ان سے بھری ہوئی ہیں۔ اور اگر کوئی ایسی روایت مل جائے جس میں عدد کا ذکر نہ ہو اور اس سے مطلق طور پر نفل نماز کو

جماعت سے ادا کرنا جائز ثابت ہوتا ہو، تو اس کو مقید پر محمول کرنا چاہئے جو دوسری روایات میں واقع ہے اور مطلق سے مقید مراد لینا چاہئے اور جواز کو دو یا تین پر منحصر کرنا چاہئے، کیوں کہ علماء حنفیہ اگرچہ اصول میں مطلق کو اپنے اطلاق پر ہی رکھنے کے قائل ہیں اور مقید پر حمل نہیں کرتے، لیکن روایات میں مطلق کو مقید پر حمل کرنا جائز بلکہ لازم جانتے ہیں۔ اور اگر ہم بفرضِ محال حمل نہ بھی کریں اور اطلاق پر ہی رہنے دیں، جب کہ یہ مطلق قوتِ ثبوت میں مقید کے برابر ہو، تو وہ اس مقید کا معارض ہو گا، حالاں کہ قوت میں مساوات ممنوع ہے۔ کیوں کہ کراہت کی روایتیں باوجود کثرت کے مختار اور مفتٰی بہا ہیں، بر خلاف اباحت کی روایتوں کے۔ اور اگر دونوں کی مساوات تسلیم کرلی جائے، تو ہم کہتے ہیں کہ کراہت و اباحت کے دلائل باہم متعارض ہونے کی صورت میں کراہت ہی کو ترجیح ہو گی۔

تشریح:

یہ ایک بڑا اہم فقہی اصول بیان فرمایا ہے کہ اگر کسی چیز کے بارے میں شک ہو کہ بدعت ہے یا سنت، تو پھر اس کو بدعت پر محمول کرنے میں احتیاط ہے، تاکہ اس سے بچا جائے۔ کیوں کہ فقہ کا مشہور قاعدہ ہے کہ دفعِ مضرت جلبِ منفعت سے اہم ہے۔

حضرت نے اس (عبارت) میں یہ فرمایا ہے کہ اگر کراہت و اباحت کے اقوال مساوی بھی ہوں تو پھر بھی کراہت کو ترجیح ہو گی۔

متن:

جیسا کہ اصولِ فقہ کے جاننے والوں کے نزدیک مقرر ہے۔ پس جو لوگ روزِ عاشوراء اور شبِ برات اور لیلۃ الرغائب (ماہ رجب کی پہلی شبِ جمعہ) میں نمازِ نوافل کو باجماعت ادا کرتے ہیں اور دو دو سو یا تین تین سو یا اس سے کم و بیش آدمی مساجد میں جمع ہوتے ہیں اور اس نماز و اجتماع اور جماعت کو مستحسن خیال کرتے ہیں، ایسے لوگ باتفاقِ فقہاء امرِ مکروہ کے مرتکب ہیں اور مکروہ کو مستحسن جاننا بڑے گناہوں میں سے ہے۔

تشریح:

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض مساجد میں اُس وقت انتارش ہو جاتا ہے کہ مسجد میں جگہ نہیں ملتی۔ باہر سڑکوں پر لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں، راستے بند ہو جاتے ہیں اور یہ سب کچھ ایک نفل کی جماعت کے لئے کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ صلوۃ التسبیح (جماعت سے) پڑھتے ہیں جو کہ ایک نفل نماز ہے۔ اس کے لئے لوگ دور دور سے آتے ہیں اور راستوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں، حالاں کہ راستوں کو بلاک کرنا بذاتِ خود جرم ہے۔ لیکن ایسا ہو رہا ہے۔ اب کیا کریں!

متن:

تداعی سے مراد نفل نماز کے ادا کرنے کے لئے دوسرے کو خبر دینا ہے۔ اور یہ معنی ان جماعتوں میں متحقق ہیں، جو عاشوراء وغیرہ کے دن قبیلہ قبیلہ ایک دوسرے کو خبر کرتے اور بلاتے ہیں کہ فلاں شیخ یا فلاں عالم کی مسجد میں جانا چاہئے اور نفل نماز جماعت سے ادا کرنی چاہئے اور اس فعل کو بطریقِ عادت ادا کرتے ہیں۔ اس قسم کی اطلاع دینا اذان و اقامت سے بھی ابلغ (زیادہ بڑھ کر) ہے۔ پس تداعی بھی ثابت ہو گئی۔ اگر تداعی کو اذان و اقامت پر ہی مخصوص رکھیں جیسا کہ

بعض روایات میں واقع ہوا ہے اور اس سے اذان و اقامت کی حقیقت مراد لیں تو پھر بھی جواب وہی ہے، جو اوپر گزر چکا کہ ایسی نماز ایک یا دو مقتدیوں کے ساتھ مخصوص ہے، وہ بھی دوسری شرط کے ساتھ جو اوپر مذکور ہو چکی ہے (یعنی مسجد کے گوشہ میں ہو)۔

جاننا چاہئے کہ چوں کہ ادائے نوافل کی بنیاد اخفاء و ستر (پوشیدگی) پر ہے، اس لئے کہ نوافل میں ریا و سمعہ کا گمان ہو سکتا ہے اور جماعت اخفاء کے منافی ہے اور فرائض کے ادا کرنے میں اظہار و اعلان مطلوب ہے، کیوں کہ یہ ریا و سمعہ کی آمیزش سے پاک ہے۔ پس ان (فرائض) کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا مناسب ہے۔ علاوہ بریں ہم یہ کہتے ہیں کہ کثرتِ اجتماع فتنہ پیدا ہونے کا محل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لئے سلطان یا اس کے نائب کا حاضر ہونا شرط قرار دیا گیا ہے، تاکہ فتنہ پیدا ہونے سے امن رہے۔ اور ان مکروہہ جماعتوں میں بھی فتنہ پیدا ہونے کا قوی احتمال ہے۔ پس یہ اجتماع بھی مشروع نہ ہو گا، بلکہ منکر اور ممنوع ہو گا۔ حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم میں ہے: **"اَلْفِتْنَةُ نَائِمَةٌ لَّعَنَ اللّٰهُ مَنْ اَيْقَظَهَا"**

ترجمہ: "فتنہ سویا ہوتا ہے، جو اس کو جگاتا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے"۔

پس اسلام کے والیوں، قاضیوں اور محتسبوں پر لازم ہے کہ اس طرح کے اجتماع سے لوگوں کو منع کریں اور اس بارے میں بہت ہی زجر و تنبیہ کریں، تاکہ یہ بدعت جس سے فتنہ برپا ہونے کا اندیشہ ہے، جڑ سے اکھڑ جائے۔ **"وَاللّٰهُ يُحِقُّ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ"** (اور اللہ تعالیٰ ہی حق کو ثابت کرتا ہے اور وہی سیدھے راستے کی ہدایت دیتا ہے)۔

اذان اور نماز کے اسرار

نماز کے لئے دعوت اذان ہے۔ اور چوں کہ نماز دین کا ستون ہے، اس لئے اس کو قائم کرنے کے لئے جو دعوت دی جاتی ہے، اس کی اہمیت کیا ہو گی! خود سوچنا چاہئیے۔ اذان کے اسرار کے بارے میں (کسی مؤذن کو لکھتے ہوئے) ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

حمد وصلوٰۃ کے بعد جاننا چاہئے کہ "کلمات اذان" سات ہیں:

(1) اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ

(اللہ بہت بڑا ہے)

یعنی اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ اس کو کسی عبادت کی حاجت ہو۔ اس مہتم بالشان معنی کی تاکید کے لئے اس کلمہ کو چار بار دہرایا گیا ہے۔

(2) اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

(میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے)

نیز وہ اپنی صفتِ کبریائی کے ساتھ ساتھ ہر عبادت گزار کی عبادت سے مستغنی ہے۔

(3) اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ

(میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں)

اور حق تعالیٰ کی طرف سے عبادت کا طریقہ ہم تک پہنچانے والے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کی پاک بارگاہ کے لائق وہی عبادت ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ ورسالت کے ذریعہ حاصل ہوئی۔

(4)حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ

(آؤ نماز کی طرف)

(5)حَیَّ عَلَی الفَلَاحِ

(آؤ فلاح وبہبود کی طرف)

یہ دو کلمے وہ ہیں جن کے ذریعے نمازی کو فلاح وبہبود اور کامیابی کی طرف لے جانے والی فرض نماز کی ادائیگی کی طرف بلایا جاتا ہے۔

(6)اَللّٰہُ اَکْبَرُ

(اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے)

یعنی کسی کی بھی عبادت اس پاک بارگاہ کے لائق نہیں۔ نیز اس کلمۂ مقدسہ کی عظمت و بزرگی ملاحظہ ہو کہ اس کو بطورِ تاکید چھ مرتبہ آذان میں لایا گیا ہے۔

(7)لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

(نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ تعالیٰ)

یعنی صرف اللہ تعالیٰ ہی عبادت کا مستحق ہے۔ اگرچہ کسی سے بھی اس کی بارگاہِ قدس کے لائق عبادت ہو نہیں سکتی۔

ان کلمات کی بزرگی سے جو نماز کے اعلان کے لیئے شارع علیہ السلام نے مقرر فرمائے ہیں، نماز کی بزرگی شان سمجھنی چاہیئے۔

تشریح:

اب نماز کے اسرار کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

جاننا چاہیئے کہ نماز میں تکبیر اولیٰ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ و تقدس عابدوں کی عبادت اور نمازیوں کی نماز سے مستغنی و برتر ہے اور وہ تکبیریں جو نماز کے ہر رکن کے بعد ہیں، وہ اس امر کے رموز و اشارات ہیں کہ یہ رکن جو ادا ہوا ہے، وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کی بارگاہِ قدس کی عبادت کے لائق کہا جاسکے۔ رکوع کی تسبیح **"سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ"** (پاک ہے میرا پروردگار، جو بڑی عظمت والا ہے) میں چوں کہ تکبیر کے معنی ملحوظ ہیں، اس لئے رکوع کے آخر میں تکبیر کہنے کا حکم نہیں فرمایا گیا، بلکہ **"سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ"** (اللہ تعالیٰ نے اس بندے کی بات سن لی، جس نے اس کی تعریف کی) (کہنے کا فرمایا گیا)۔ برخلاف دونوں سجدوں کے، کہ ان میں بھی اگرچہ تسبیحات ہیں، پھر بھی اول و آخر تکبیر **"اَللّٰهُ اَكْبَرُ"** کہنے کا حکم فرمایا ہے، تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ سجود میں چوں کہ نہایت عاجزی و پستی اور نہایت ذلت و انکساری ہے، اس لئے حقِ عبادت ادا ہو جاتا ہے۔ لہذا اس وہم کو دور کرنے کے لئے سجود کی تسبیح **"سُبْحَانَ

رَبِّیَ الْاَعْلٰی" (پاک ہے میرا پروردگار، جو اعلیٰ شان والا ہے) میں لفظ "**اَعْلٰی**" اختیار کیا ہے اور تکبیر کا تکرار بھی مسنون ہوا۔ اور چوں کہ نماز مومن کی معراج ہے، اس لئے نماز کے آخر میں ان کلمات کے پڑھنے کا حکم صادر فرمایا، جن کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شبِ معراج میں مشرف ہوئے تھے۔ لہٰذا نمازی کو چاہئے کہ اپنی نماز کو اپنے لئے آلۂ معراج بنائے اور نماز ہی میں انتہائی قربِ خداوندی ڈھونڈے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**اَقْرَبُ مَا یَکُوْنُ الْعَبْدُ مِنَ الرَّبِّ فِی الصَّلٰوۃِ**" (بندہ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ قرب نماز میں حاصل ہوتا ہے)۔ اور چوں کہ نمازی اللہ تعالیٰ عزشانہ سے مناجات کرنے والا اور نماز کے ادا کرتے وقت حق تعالیٰ کی عظمت و جلال کا مشاہدہ کرنے والا ہوتا ہے اور حق تعالیٰ کا رعب و ہیبت اس پر چھا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی تسلی کے واسطے نماز کو دو سلاموں پر ختم کرنے کا امر فرمایا۔ اور یہ جو حدیث نبوی علی صاحبھا الصلوٰۃ والسلام میں ہر فرض نماز کے بعد سو مرتبہ تسبیح و تحمید، تکبیر اور تہلیل کا حکم ہے، فقیر کے علم میں اس کا راز یہ ہے کہ نماز کی ادائیگی میں جو قصور و کوتاہی واقع ہوئی ہو، اس کی تلافی تسبیح و تکبیر کے ساتھ کی جائے، تاکہ اپنی عبادت کے ناتمام و ناقابل ہونے کا اقرار ہو سکے۔ اور چوں کہ حق تعالیٰ کی توفیق سے عبادت کا ادا کرنا میسر ہوا ہے، تو اس نعمت کا "**اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ**" کہہ کر شکر بجالانا چاہئے اور حق تعالیٰ کے سوا اور کسی کو عبادت کا مستحق نہیں بنانا چاہئے۔

امید ہے کہ جب نماز اس طرح ان شرائط و آداب کے ساتھ ادا کی جائے اور اس کے بعد تہِ دل سے ان کلماتِ طیبہ کے ساتھ تقصیر و کوتاہی کی تلافی کر لی جائے اور توفیقِ عبادت کی نعمت کا

شکر ادا کیا جائے اور حق تعالیٰ کے سوا کسی غیر کے مستحقِ عبادت ہونے کی نفی کرلی جائے، تو امید ہے کہ وہ نماز حق تعالیٰ جل شانہ کی بارگاہ میں قبولیت کے لائق ہو جائے گی اور ایسی نماز ادا کرنے والا فلاح پانے والا ہو جائے گا۔

مکتوب نمبر 305 میں نماز میں حضورِ قلب سے کیا مراد ہے ؟ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

اللہ تعالیٰ تم کو ہدایت دے! واضح ہو کہ نماز کو کامل طور پر ادا کرنے اور اس میں کمال حاصل ہونے سے مراد؛ فقیر کے نزدیک یہ ہے کہ نماز کے فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات جن کا بیان کتبِ فقہ میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے، (ان) سب کو احتیاط سے ادا کرنا چاہئے۔ ان چاروں امور کے علاوہ اور کوئی امر ایسا نہیں ہے، جس کو نماز کے کامل کرنے میں دخل ہو۔ نماز کا خشوع و خضوع بھی ان ہی چاروں سے وابستہ ہے۔

بعض لوگ ان امور کے جان لینے کو کافی سمجھتے ہیں اور عمل کرنے میں سستی و کاہلی کرتے ہیں۔ اس لئے لازمی طور پر نماز کے کمالات سے بے نصیب رہتے ہیں۔ اور بعض لوگ حق سبحانہ کے ساتھ حضورِ قلب میں بڑا اہتمام کرتے ہیں، لیکن اعمالِ ادبیۂ جوارح (یعنی ظاہری اعضاء سے تعلق رکھنے والے مستحبات) کی طرف کم توجہ کرتے ہیں، صرف فرائض اور سنتوں پر کفایت کرتے ہیں۔ یہ لوگ بھی نماز کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں اور کمالِ نماز کو غیرِ نماز سے ڈھونڈھتے ہیں۔ کیوں کہ حضورِ قلب کو نماز کے احکام سے نہیں جانتے۔

اور یہ جو حدیث میں آیا ہے: **"لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ"**۔ (نماز حضورِ قلب کے بغیر کامل نہیں ہوتی) ممکن ہے کہ اس میں حضورِ قلب سے مراد یہ ہو کہ ان امورِ اربعہ کے ادا کرنے میں دل کو حاضر رکھا جائے۔ تاکہ ان امور میں سے کسی امر کے بجالانے میں کچھ فتور واقع نہ ہو۔ اس حضورِ قلب کے علاوہ اور کوئی حضور فی الحال اس فقیر کی سمجھ میں نہیں آتا۔

تشریح:

فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات، اگر کوئی ان سب چیزوں کا اہتمام کرلے تو نماز کے اندر واجب درجہ کا خشوع و خضوع نصیب ہو جاتا ہے۔

مکتوب نمبر 305 میں مبتدی اور منتہی کی نماز کے فرق کے بارے میں سوال کا جواب ارشاد فرماتے ہیں:

متن:

سوال:

جب نماز کی تکمیل اور اس کا کمال ان چار امور کے بجالانے سے وابستہ ہوا اور کوئی دوسرا امر کمالِ نماز کے لئے ملحوظ نہ رہا، تو منتہی اور مبتدی بلکہ عامی کی نماز میں کیا فرق ہوا، جو ان چاروں امور کو بجالانے پر مشروط ہے؟

جواب:

مبتدی اور منتہی کی نماز میں فرق عمل کرنے والے کی طرف سے ہے، نہ کہ عمل کی رو سے۔ ایک ہی عمل کا ثواب عمل کرنے والوں کے تفاوت سے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً: وہ عمل جو کسی

مقبول و محبوب عامل سے وقوع میں آئے، اس کا اجر اس کے اجر سے کئی گنا زیادہ ہو گا جو اس عامل کے سوا کسی غیر کے اسی عمل پر مرتب ہو، کیوں کہ عامل جتنا عظیم القدر ہوتا ہے، اسی قدر اس کے عمل کا اجر بھی عظیم تر ہو گا۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ عارف کا نمائشی عمل مرید کے اخلاص والے عمل سے بہتر ہوتا ہے۔

تشریح:

فرمایا کہ عارف کا نمائشی عمل غیر عارف کے اخلاص والے عمل سے بہتر ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عارف جو کچھ کرتا ہے، وہ اصلاً تو اللہ ہی کے لئے کرتا ہے یعنی اس کا دل اللہ کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن اس کا ظاہر لوگوں کی طرف ہوتا ہے یعنی اس عمل میں وہ لوگوں کا حق ادا کرتا ہے کہ لوگوں کو اس عمل سے فائدہ پہنچائے۔ لہذا ظاہر ہے کہ اس میں نمائش بھی ہو جائے گی۔ لیکن چوں کہ وہ نمائش اللہ کے لئے ہے، اس لئے لوگوں کو فائدہ بھی ہو جاتا ہے اور اس کو نقصان بھی نہیں ہوتا۔ اس لئے عارف کی نماز غیر عارف کی نماز سے بہتر ہے۔

متن:

عارف کا نمائشی عمل مرید کے اخلاص والے عمل سے بہتر ہوتا ہے۔ پھر کس طرح بہتر نہ ہو! جب کہ عارف کا عمل سراسر اخلاص سے لبریز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سہو کو اپنے صواب سے بہتر جانتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سہو کی آرزو کرتے تھے۔

تشریح:

یعنی کہتے تھے کہ وہ سہو جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا تھا، کاش مجھ سے بھی ہو جائے۔

متن:

جیسا کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: **"یَا لَیْتَنِیْ کُنْتُ سَهْوَ مُحَمَّدٍ"**۔ (اے کاش! میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا سہو ہو جاتا)۔ گویا ان کی آرزو یہی تھی کہ کلی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سہو ہو جائیں۔ لہذا اپنے تمام اعمال واحوال کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عملِ سہو سے کم جانتے ہیں اور پوری آرزو کے ساتھ سوال کرتے ہیں کہ ان کی تمام نیکیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سہو کے برابر ہی ہو جائیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سہو کی مثال یہ ہے کہ ایک مرتبہ آں سرور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار رکعت والی (فرض) نماز میں سہو کی وجہ سے دو رکعت پر سلام پھیر دیا جیسا کہ مروی ہے۔ پس منتہی کی نماز پر دنیاوی نتائج اور ثمرات کے باوجود آخرت کا بڑا بھاری اجر بھی مرتب ہوتا ہے۔ بخلاف مبتدی اور عامی کی نماز کے۔

تشریح:

دیکھیں! عجیب بات فرمائی کہ اعمال کی وجہ سے ثواب کا معاملہ اور ہے اور عمل کرنے والے کی وجہ سے ثواب کا معاملہ اور ہے۔ مثلاً: ایک نوکر ہے، وہ چھوٹے قد کا ہے، چھوٹے چھوٹے ہاتھ ہیں، کم طاقت ہے اور دوسرا نوکر اس سے بہت طاقت ور ہے۔ جو کام اِس کے حوالے ہے اور یہ کر رہا ہے، وہی کام دوسرے کے بھی حوالے ہیں اور وہ بھی کر رہا ہے یعنی دونوں ایک ہی کام پر لگے ہوئے ہیں، یہ اینٹیں اٹھا رہا ہے تو وہ بھی اینٹیں اٹھا رہا ہے اور وہ اس میں خیانت نہیں کر رہا یعنی وقت ضائع نہیں کر رہا، لیکن ظاہر ہے کہ کمزور نوکر کتنی اینٹیں اٹھا سکے گا؟ اور یہ دوسرا طاقت ور

دھڑا دھڑ کام کئے جارہا ہے یعنی یہ کام کرنے والے کے اوپر منحصر ہے کہ اس کے اندر کتنی طاقت ہے۔ اسی طرح عمل بھی روحانیت پر منحصر ہے کہ اس کے اندر کتنی روحانیت ہے۔ منتہی کے اندر روحانیت زیادہ ہوتی ہے جب کہ مبتدی کے اندر روحانیت کم ہوتی ہے۔ اس لئے اگرچہ مبتدی سارے اعمال کرے گا، لیکن اپنی روحانیت کے مطابق کرے گا، جب کہ منتہی اپنی روحانیت کے مطابق کرے گا۔ اس لئے اجر میں فرق واقع ہو گا۔

یہ حضرت نے بہت زبردست بات ارشاد فرمائی ہے۔

متن:

منتہی کی نماز کی چند خصوصیات بیان کی جاتی ہیں، ان سے قیاس کر لیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ منتہی نماز میں قرأتِ قرآن کے وقت اور تسبیحات و تکبیرات کے اوقات میں اپنی زبان کو شجرۂ موسوی کی مانند پاتا ہے اور اپنے قُویٰ و اعضاء کو آلات و وسائط سے زیادہ نہیں جانتا۔ اور کبھی ایسا محسوس کرتا ہے کہ ادائیگی نماز کے وقت اس کے باطن و حقیقت نے اس کے ظاہر و صورت سے اپنا تعلق منقطع کر لیا ہے اور وہ عالمِ غیب سے ملحق ہو گیا ہے اور غیب کے ساتھ مجہول الکیفیت نسبت پیدا کر لی ہے اور جب نماز سے فارغ ہوتا ہے تو پھر اِس عالم کی طرف رجوع کرتا ہے۔

یا اصل سوال کے جواب میں کہتا ہوں کہ یہ مذکورہ چاروں اعمال (فرض، واجب، سنت اور مستحب) کا اہتمام بتمام و کمال بجالانا منتہی کا نصیب ہے. مبتدی اور عامی ان امور کو بتمام و کمال ادا کرنے کی توفیق سے دور ہیں. اگرچہ ان کے لئے بھی ممکن اور جائز ہے، لیکن ایسا کم ہوتا ہے، کیوں کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ﴾ (البقرۃ:45)

(ترجمہ: خاشعین کے علاوہ دوسروں پر نماز بہت گراں ہے)۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی

(اور سلام ہو اس پر، جس نے ہدایت کی پیروی کی)

تشریح:

یوں سمجھ لیجئے کہ حضرت نے ہمیں اعمال کے ذریعہ اللہ تعالی کے قرب کو حاصل کرنے کا طریقہ سکھایا ہے، جس میں سب سے پہلے نماز کا مقام ہے۔ ان شاء اللہ اگلی دفعہ رمضان شریف کے بارے میں بات ہو گی، پھر زکوٰۃ اور پھر حج کے بارے میں۔

ان باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ اللہ تعالی ہم سب کو نصیب فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مقاماتِ قطبیہ و مقالاتِ قدسیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ

اَمَّا بَعْدُ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقالاتِ قدسیہ اور مقاماتِ قطبیہ میں زہد اور عشق کے بارے میں حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جو بیان چل رہا تھا، اس کا جتنا حصہ گذشتہ درس میں بیان ہو گیا تھا، آج کے درس میں ان شاء اللہ، اس سے آگے کا حصہ بیان ہو گا۔

چنانچہ کاکا صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

متن:

جو عاشق کمال اور انتہا کو پہنچ جائے، تو وہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی حجاب کے بغیر اور کسی مقام میں نہیں ہوتا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس جماعت کے بارے میں رمزیہ طور پر فرمایا ہے کہ:

"لِیْ مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَّا یَسَعُ فِیْہِ مَلَکٌ مُقَرَّبٌ وَلَا نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ "(المقاصد الحسنۃ علی ما اشتہر علی الالسنۃ: رقم الحدیث: 883)

"اللہ تعالیٰ کے ہاں مجھے ایک وقت میسر ہوتا ہے کہ جس میں کسی مقرب فرشتہ اور نہ کسی رسول پیغمبر کی گنجائش ہوتی ہے"۔

یہ وہ مقام ہے کہ نبیِ مرسل اور ملکِ مقرب کو بھی اس کی خبر نہیں۔

لیکن یہ بات اولیاء اللہ نہیں کہا کرتے، کیوں کہ وہ اولیاء ہوتے ہیں، (نبی نہیں ہوتے) وہ جو فرمایا گیا ہے کہ **"إِنِّيْ أَعْرِفُ رِجَالًا مِّنْ أُمَّتِيْ فِيْ لَيْلَةِ الْمِعْرَاجِ مَنْزِلَتُهُمْ بِمَنْزِلَتِيْ عِنْدَاللهِ تَعَالٰى"**۔ "میں اپنی امت کے اُن آدمیوں کو پہچانتا ہوں، جن کی منزل اور مقام اللہ تعالیٰ کے نزدیک معراج کی رات میں میری منزل اور مقام کے برابر تھا"۔

اے برادرِ عزیز! عشق تمثیلی لباس رکھتا ہے اور اگر تمثیل نہ ہوتی، تو سالک اور راہِ طریقت کے راہ رو کافر ہو جاتے، کیوں کہ اگر ہر چیز کو مختلف اوقات میں ایک شکل پر ہی دیکھتا رہے، تو اس سے انسان نفسیاتی طور پر سیر ہو جاتا ہے، جو کہ باعثِ ملال ہوتا ہے۔ اور جب ہر لحظہ اور ہر آن جمال و حسن میں زیادتی اور اضافہ دیکھتا ہے، تو عشق بھی زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ دید کا اشتیاق اور ملاقات کا شوق مزید بڑھتا جاتا ہے۔ پس **﴿يُحِبُّهُمْ﴾** (وہ اُن کے ساتھ محبت کرتا ہے) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کے ساتھ محبت کرتا ہے، ہر وقت ایک تمثیل کا حامل ہوتا ہے، جو **﴿يُحِبُّوْنَهٗ﴾** کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اسی طرح **﴿يُحِبُّوْنَهٗ﴾**[1] بھی۔ پس اس حالت میں محبوب کو انتہائی کمال کے ساتھ کمالِ عشق و محبت اور پورے شوق کے ساتھ دیکھنا ہوتا ہے۔

ابیات:

---

[1] اُس کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ سورۃ المائدہ آیت 54 پوری آیت شریفہ کا ترجمہ یہ ہے: "اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا، تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگ پیدا کر دے گا، جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مؤمنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں، خدا کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔ یہ خدا کا فضل ہے، جسے چاہے دیتا ہے۔ اور خدا بڑی کشائش والا (اور) جاننے والا ہے"۔)

ہر روز بعشق تو بجمال و گرم
و ز حسن تو در بند جمال و گرم
تو آیت حسن را جمال دیگرے
من آیت حسن را کمال دگرم

ترجمہ: "تمہارے عشق میں ہر روز جداگانہ قسم کے جمال سے آشنا ہوتا ہوں اور تمہارے حسن کی نیرنگیوں سے نرالے حسن و جمال کا اسیر ہوتا ہوں۔ تم حسن و جمال کی ایک جداگانہ نشانی ہو اور میں حسن کے کمال کی ایک علیحدہ علامت ہوں"۔

پس اے بھائی! معشوق کا رزق اور حصّۂ لطف کس چیز میں ہے اور عاشق کس چیز سے اپنا نصیب حاصل کرتا ہے اور خود عشق کس چیز سے زندہ ہے؟ لیکن عشق کے بارے میں کیا بیان کیا جائے اور کیا ظاہر کیا جائے؟ اس کے بارے میں رمز اور مثال کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

ورنہ اس رمز و مثال اور اشارت کے علاوہ عشق کے متعلق کیا کہا جائے اور کیا کہنا چاہئے؟ اگر عبادت میں عشق کی تفصیل اور حال بیان ہو سکتا اور اشارات میں اس کی حقیقت سما سکتی، تو زمانے سے فارغ دل اور عالَمِ عقبیٰ کے طلب گار لوگ اپنے دورِ حیات میں عشق کے معنیٰ کے جسم سے فارغ نہ ہوتے اور عشق کے جمال و حسن سے محروم نہ ہوتے اور حجاب میں نہ ہوتے۔

تشریح:

واقعی عشق کی باتوں کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اس لئے اس کو سمجھنے کے لئے کچھ اشارات ور موز ہوتے ہیں، جن کے ذریعے سے انسان تھوڑا تھوڑا سمجھنے لگتا ہے۔ ورنہ یہ ممکن نہیں ہے کہ انسان ان باتوں کو محسوس کر سکے۔

اس لئے فرماتے ہیں: جو عاشق کمال اور انتہا کو پہنچ جائے یعنی اس کا عشق بہت زیادہ ہو جائے اور کمال تک پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ کی کبریائی سے حجاب ہٹتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں آپ ﷺ نے رمزیہ طور پر ارشاد فرمایا: ''میرے لئے اللہ پاک کے ساتھ ایک وقت ہے جس میں کوئی ملکِ مقرب اور نبیِ مرسل میرے درمیان میں نہیں آتا''۔ یعنی یہ وہ مقام ہے کہ جس کی نبیِ مرسل اور ملکِ مقرب کو بھی خبر نہیں ہوتی۔

میانِ عاشق و معشوق رمزی است
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

ترجمہ: ''عاشق اور معشوق کے درمیان کچھ ایسے رموز ہوتے ہیں کہ کراماً کاتبین کو بھی ان کی خبر نہیں ہوتی''۔

اصل میں عاشق اپنے عشق کی بدولت ترقی کرتا رہتا ہے اور اس کے اوپر محبوب کے حسن کے پردے کھلتے رہتے ہیں اور معشوق جب قدرت والا ہو تو اس کا حسن روز بروز بڑھتا رہتا ہے۔ ایک نئی شان کے ساتھ وہ آتے ہیں۔

﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ﴾ (الرحمٰن: 29)

ترجمہ: ''وہ ہر روز کسی شان میں ہے''۔

یہ قرآن پاک میں اللہ پاک نے اپنے بارے میں فرمایا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی شان روز بڑھتی رہتی ہے اور بلند ہوتی رہتی ہے۔ اب ایک طرف محبوب کا شوق اس لئے بڑھتا ہے کہ اس کے اوپر اللہ جل شانہ کے جمال کا پرتو پڑتا رہتا ہے اور ترقی کی وجہ سے مزید پرتیں کھلتی ہیں اور دوسری طرف ادھر سے بھی شان میں اضافہ ہو رہا ہوتا ہے۔ اس لئے یہ شوق مسلسل بڑھ رہا ہوتا ہے۔ اس شوق کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

الحمد للہ، اللہ کا شکر ہے کہ کچھ ہماری کتابیں ہیں، ان کتابوں میں سے ایک ''شاہراہِ محبت'' ہے جو حاجیوں کے لئے احتیاط کے بارے میں ہے۔ اور دوسری کتاب ''پیغامِ محبت'' ہے جس میں دل کی باتیں ہیں اور تیسری کتاب ''فکرِ آگہی'' ہے۔ اس کتاب میں فکر کے بارے میں لکھا گیا ہے یعنی انسان صحیح فکر کیسے حاصل کرے۔ جب یہ تین کتابیں مکمل ہو گئیں تو گویا ایک ہی چیز کی تشریح تین طرح سے ہو گئی۔ اس لئے دل میں خیال آیا کہ اب مزید نہیں کہنا چاہئے۔ جتنا اس موضوع پر کہنا تھا، وہ پورا ہو گیا۔ کیوں کہ شاعری بذاتِ خود تو مقصود چیز نہیں ہے۔ اب دوسری مقصودی چیزوں کی طرف متوجہ ہونا چاہئے اور اس کام کو روکنا چاہئے۔ یہ صرف دل میں خیال آیا تھا۔ میں نے باقاعدہ اس بات کا کسی سے اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن جب 2012 میں حج پر جاتے ہوئے میں نے احرام باندھا، تو پہلا شعر یہ وارد ہوا۔

زبانِ عشق کی انتہا نہیں ہے
دیکھنا! رکنا اس سے اچھا نہیں ہے
روک لے اس کو یہ کیا کہتے ہو؟
یہ کسی اور کا ہے، تیرا نہیں ہے

ان دو شعروں میں پورا میسج تھا۔ دوسرے لفظوں میں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں تو صاف بات کہہ دی گئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ تو کیسے عشق کی زبان کو روک سکتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے، کیوں کہ اس کی انتہا نہیں ہے۔ اور یہ جو تو رکنے کا ارادہ کر رہا ہے، یہ بھی اچھا نہیں ہے اور تو اس کو روک بھی نہیں سکتا۔ اگر تو روکنا بھی چاہے گا، تب بھی نہیں روک سکے گا۔

روک لے اس کو یہ کیا کہتے ہو؟
یہ کسی اور کا ہے، تیرا نہیں ہے

یعنی جس طرف سے آ رہا ہے، وہ تیرا کام تو نہیں ہے۔ وہ تو خود ہی بھیج رہا ہے۔ اس موقع پر مجھے بالکل پیغام مل گیا تو میں نے اپنا ارادہ ترک کر لیا اور الحمد للہ اس کے بعد پھر اسی غزل میں اگلی کتاب کا عنوان بھی آ گیا کہ اگلی کتاب کون سی ہو سکتی ہے۔

بہر حال یہ میں عرض کر رہا تھا کہ عشق کا کمال اور اس کی انتہا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ یعنی آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس میں تشنگی ہی ہے، بے آرامی اور بے چینی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ عاشق آرام کر لے اور عاشق کو چین حاصل ہو جائے۔ عاشق کے ساتھ بے چینی لگی ہوئی ہے۔ لیکن یہ بے چینی سو اطمینانوں سے بڑھ کر ہے۔ بالخصوص جب یہ بھی پتا ہو کہ ادھر سے بھی جواب ملتا ہے، پھر تو بات ہی الگ ہوتی ہے۔ اس میں پھر انسان تمام چیزوں کو بھول جاتا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے لطیف اشارے کے ذریعے سے اس میں کلام فرمایا ہے۔ حضرت نے فرمایا: اگر کسی کو محبوب زور سے کھینچے اور پھر اسے کہے کہ اگر تم چاہو تو چھوڑ دوں؟ یعنی اگر تکلیف ہو رہی ہو تو چھوڑ دیتا ہوں، تو مُحِب کیا کہے گا؟ مُحِب تو کہے گا کہ نہیں، بلکہ اور بھی کھینچئے، بے شک تکلیف ہو رہی ہے۔ لیکن یہ تکلیف؛ تکلیف نہیں ہے، یہ تکلیف بھی ماشاء اللہ سو

اطمینانوں سے بڑھ کر ہے۔ یہی بات اصل میں بنیاد ہے۔ میں نے حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ بتایا تھا کہ ایک دفعہ حضرت کے پاس ایک صاحب تشریف لائے تھے اور ایک مہمان اس کو دیکھ رہے تھے۔ حضرت نے اس صاحب کو گریبان سے پکڑا اور نیچے گرا کر اس کی جیب سے پیسے نکالے اور ساتھی سے کہا: جاؤ، اس کی مٹھائی لے آؤ۔ جب وہ ساتھی مٹھائی لے آیا، تو حضرت نے مٹھائی سب کے درمیان تقسیم کر دی۔ وہ مہمان حیران تھا کہ یہ تو بڑے بزرگ ہیں اور یہ ان کی شان کے لائق تو نہیں ہے۔ یہ انہوں نے کیا طریقہ کر لیا! اس کو بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ انہوں نے اپنے دوست سے جو ان کے ساتھ آیا تھا، پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ انہوں نے کہا: چل کر انہی سے پوچھ لیتے ہیں جن کے ساتھ یہ معاملہ ہو رہا ہے۔ اس کے بعد وہ دونوں ان کے پاس چلے گئے، ان سے کہا کہ یہ کیا مسئلہ ہے؟ یعنی ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا، آپ کے ساتھ تو مولانا نے بڑا ظلم کیا۔ انہوں نے کہا: میں اسی کے لئے تو آتا ہوں، تاکہ میرے ساتھ یہی معاملہ ہو۔

یہ وہ چیز ہے کہ جسے انسان نہیں سمجھ سکتا، اس لئے اس معاملے میں عشّاق کی بات مان لی جائے۔

جب تک نہ لگی ہو کسی دل میں آگ
پرائی لگی، دل لگی سوجھتی ہے

مطلب یہ ہے کہ واقعی جب تک کسی کو عشق حاصل نہ ہو تو دوسرے کی کیفیت کو انسان نہیں سمجھ سکتا۔ بلکہ ممکن ہے کہ دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق شروع کر دے اور ایسے

لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا بھی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ”تم اللہ کا ذکر اتنا کرو کہ لوگ تمھیں پاگل کہیں“ یعنی والہانہ انداز میں ذکر کرو۔ جب ایسا ہو گا تو لوگ تمھیں پاگل کہیں گے۔

بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ہر خاندان کے اندر ابتدا میں اگر کوئی شخص اللہ کی طرف آتا ہے۔ تو اس کی تیزی کو دیکھ کر سب لوگ اس پر پاگل ہونے کا فتوی لگاتے ہیں۔ بعد میں بے شک وہ کنٹرول ہو جائے اور ساری چیزیں سمجھ میں آ جائیں۔ لیکن ابتدا میں تو اس کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے۔

حضرت مولانا حامد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اجازت دی۔ تو ان کے اوپر سکر اور استغراق کی کیفیت طاری تھی۔ اکیس بائیس سال کے نوجوان آدمی تھے۔ ان کے والد صاحب اگرچہ بڑے عالم تھے اور وہ خود بھی حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ مولانا محمد میاں صاحب گھبرا گئے کہ یہ کیا ہو گا؟ اس طرح تو بیٹا میرے ہاتھ سے چلا گیا۔ انہوں نے حضرت مدنی رحمہ اللہ سے اس کا ذکر کیا، حضرت نے فرمایا: اس وقت آپ کا ان کے اوپر خرچ کرنا بہترین صدقہ جاریہ ہے۔ یعنی اس وقت اگر آپ اس پر انفاق کرتے ہیں۔ اس کو نہیں چھیڑتے اور آپ اس کی کفالت کرتے رہتے ہیں تو یہ بہترین صدقہ جاریہ ہے۔ بعد میں حضرت حامد میاں صاحب ایک عالم متوکل بن گئے اور پورے مدرسے کو چلاتے تھے۔ میں حضرت کے درس میں بیٹھا ہوں۔ قرآن پاک کا بڑا عجیب درس ہوتا تھا۔ اس لئے انتہاء میں تو یہ بات حاصل ہو جاتی ہے، لیکن ابتدا میں جو کیفیت ہوتی ہے، اس سے واقعی لوگ گھبرا جاتے ہیں۔ مگر جو لوگ سمجھ دار ہوتے ہیں، اس راستے سے گزرے ہوئے ہوتے ہیں، وہ اس کی وجہ سے پریشان نہیں ہوتے۔

اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ جل شانہ کے عشق کا معاملہ تو واقعی باقی عشاق و معشوقوں سے مختلف ہے، کیوں کہ اللہ تعالی شان اور قدرتوں کے مالک ہیں اور اللہ جل شانہ کی شان کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ﴾ (الرحمٰن: 29)

ترجمہ: ''وہ ہر روز کسی شان میں ہے''۔

ایک تو اللہ تعالیٰ کی شان ماشاء اللہ ہر لحظہ بڑھتی رہتی ہے اور دوسرا اللہ کے عاشق کی طلب روز بروز بڑھتی رہتی ہے، کیوں کہ اس پر مزید اللہ کی شان کھلتی ہے، اور مزید کھلتی رہتی ہے۔ اس وجہ سے عاشق کی طلب اور شوق بڑھتا جاتا ہے۔ اب دونوں طرف سے ہونی والی بات ہے کہ ادھر سے اظہار ہو رہا ہوتا ہے اور ادھر سے فنائیت کا عالم ہو رہا ہوتا ہے۔

بہر حال! یہ ساری باتیں انسان سمجھ نہیں سکتا، اس لئے حضرت نے یہ اشعار ذکر فرمائے ہیں:

متن:

اشعار:

ہر روز بعشق تو بجمال و گرم
و ز حسن تو در بند جمال و گرم
تو آیت حسن را جمال دیگرے
من آیت حسن را کمال دگرم

ترجمہ: "تمہارے عشق میں ہر روز جداگانہ قسم کے جمال سے آشنا ہوتا ہوں، اور تمہارے حسن کی نیرنگیوں سے نرالے حسن و جمال کا اسیر ہوتا ہوں، تم حسن و جمال کی ایک جداگانہ نشانی ہو اور میں حسن کے کمال کی ایک علیحدہ علامت ہوں"۔

پس اے بھائی! معشوق کا رزق اور حصّۂ لطف کس چیز میں ہے اور عاشق کس چیز سے اپنا نصیب حاصل کرتا ہے اور خود عشق کس چیز سے زندہ ہے؟ لیکن عشق کے بارے میں کیا بیان کیا جائے اور کیا ظاہر کیا جائے؟ اس کے بارے میں رمز اور مثال کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے"۔

تشریح:

اصل میں یہی بات ناسمجھ لوگوں کو پریشان کرتی ہے۔ سمجھ دار لوگ چاہے کسی بھی رخ سے سمجھ دار ہوں، ان کی بات اور ہوتی ہے، لیکن ناسمجھوں کو اس سے پریشان کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اعتبارات، اشارات اور رموز، یہ سب مجبوراً ہیں، کیوں کہ ان کو انسان محسوس تو کر سکتا ہے، اعتراف بھی کر سکتا ہے، لیکن ان کا احاطہ نہیں کر سکتا اور کبھی ان کو سمجھ بھی نہیں سکتا۔ جب یہ حالت ہو، تو اس صورت میں پھر رموز اور اشارات ہی کی زبان چلتی ہے اور جن لوگوں کے اوپر اللہ پاک نے جتنی بات کھولی ہوتی ہے، وہ اسی حد تک کے رموز و اشارات بیان کر سکتے ہیں۔ اب جن لوگوں میں ان کی جتنی سمجھ ہوتی ہے، وہ اتنا ان کا ادراک کر سکتے ہیں۔ اگر کسی کے اشارات اور رموز اونچے level (درجے) کے ہوں اور کسی کا ادراک نیچے level (درجے) کا ہو، تو اس صورت میں پھر پریشانی اور بے اطمینانی ہوتی ہے۔ یہی تو وجہ ہے کہ ہمارے جتنے بھی بڑے اکابر گزرے ہیں، جن میں حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ہیں، انہوں نے عوام کی زبان میں نیچے آکر بات کی ہے، کیوں کہ اللہ پاک نے ان کو ایک خاص پیغام

دیا تھا. اس پیغام کو پہنچانے کے لئے حضرت نے بہت نیچے آکر اس کو بیان کیا اور کوشش کی کہ وہ باتیں لوگوں کو سمجھا دیں. لیکن بعض حضرات اپنے مقام کے مطابق بات کر دیتے ہیں تو ان کی باتوں کو سننے سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے فرماتے ہیں کہ رموز و اشارات دو دھاری تلوار ہیں، جو دونوں طرف کاٹ سکتی ہے۔ یعنی اس سے اچھائی بھی حاصل ہوتی ہے اور اگر کسی کو سمجھ میں نہ آئیں، تو ان کی وجہ سے مسائل بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر کوئی ان رموز و اشارات کو نہ سمجھتا ہو تو پتا نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے، حضرت وہ شاعر تھے کہ خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں ارشاد فرماتے تھے کہ اگر شریعت اجازت دیتی، تو میں وصیت کرتا کہ ان کو میرے ساتھ دفن کیا جائے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی اس بات کا مطلب تو ظاہر ہے کہ جیسے آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر میں اللہ کے علاوہ کسی کے سامنے سجدہ کرنے کا کسی کو کہتا، تو میں عورت کو حکم دیتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔ لفظ ''اگر'' سے جو بات کہی جاتی ہے، اس میں حکم تو اپنی جگہ قائم رہتا ہے، لیکن کسی بات کی intensity (شدت و اہمیت) سمجھانے کے لئے ''اگر'' سے بات کہی جاتی ہے۔ جیسے آپ ﷺ نے بیوی پر شوہر کے حق کی intensity (شدت و اہمیت) کو سمجھانے کے لئے مذکورہ بالا بات ارشاد فرمائی۔ اسی طرح خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اپنے تعلق کو سمجھانے کے لئے یہ بات فرمائی تھی۔ اب اگر امیر خسرو رحمہ اللہ کے مقام کو دیکھتے ہوئے ان کا یہ شعر سمجھ میں نہ آئے تو کیا کریں؟ ع

کافر عشقم مسلمانی مرا در کار نیست

میں عشق کا کافر ہوں، مجھے مسلمانی نہیں چاہئے۔ اس مفہوم کو دوسرے الفاظ میں یوں کہتے ہیں: ع

ہر رگِ من تار گشتا حاجتِ زنار نیست

یعنی میرا تو ہر تار زنار ہے، مجھے زنار کی حاجت نہیں ہے۔ اب اس شعر کا کیا مطلب لیا جائے؟ اس وجہ سے جب تک کوئی شخص رموز کی زبان نہ جانتا ہو تو اس کو ایسے اشعار سے فائدہ کی بجائے نقصان ہوتا ہے۔ اگر کوئی رموز کی زبان کو جانتا ہو، تو اس کو پھر فائدہ ہوتا ہے۔

اب اس شعر میں کافرِ عشق کا مطلب فنائیت ہے، یعنی حضرت اس میں اپنی فنائیت کو بیان فرمارہے ہیں کہ مجھے فنائیت چاہئے، مجھے اپنا ہوش نہیں چاہئے۔ اب حضرت تو یہ فرمانا چاہ رہے ہیں، لیکن لوگ پتا نہیں اس کا کیا مطلب مراد لیں گے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے اس کا بہت بڑا ذوق عطا فرمایا تھا۔ حضرت کے مواعظ میں جا بجا ان حضرات کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ ہر دوسرے تیسرے صفحہ پر دو تین اشعار ہوتے ہیں۔ بالخصوص حضرت علامہ عراقی رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار، حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کے وہ اشعار، جو حضرت کی زبان سے ادا ہوتے ہیں، ان سے تو پتا چلتا ہے کہ ان کے اندر جذب ہے وہ جذب بہت اہم ہے، کیوں کہ ویسے تو سلوک کا راستہ بہت محفوظ ہے اور اس میں انسان آہستہ آہستہ چلتا ہے، لیکن محفوظ طریقے سے چلتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ پہنچنا بھی ہوتا ہے۔ تو پہنچنے کے لئے پھر کیفیتِ جذب کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ سلاسل میں پہلے سلوک طے کرایا جاتا تھا، بعد میں جذب حاصل ہوتا تھا۔ حضرت نقشبند رحمۃ اللہ علیہ نے اس طریق کو تبدیل کر دیا اور انہوں نے پہلے جذب قرار دیا اور پھر اس کے بعد سلوک طے کراتے، ان کا طریقہ کار یہی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ

لوگوں نے اس کو غلط سمجھ لیا اور وہ جذب پر ہی کفایت کر کے بیٹھ گئے، آگے سلوک طے نہیں کراتے، جس کی وجہ سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان چیزوں کے ساتھ دوسری بہت ساری چیزیں آ جاتی ہیں۔ لہٰذا اگر نفس کی اصلاح نہ ہو، تو لوگ ان کو اپنے نفس کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں، اس لئے جذب کے ساتھ نفس کی اصلاح بہت ضروری ہے، نفس کی اصلاح کے بغیر جو جذب حاصل ہو، وہ بہت خطرناک ہے۔

اس لئے حضرت نے فرمایا:

متن:

ورنہ اس رمز و مثال اور اشارت کے علاوہ عشق کے متعلق کیا کہا جائے اور کیا کہنا چاہئے؟ اگر عبادت میں عشق کی تفصیل اور حال بیان ہو سکتا اور اشارات میں اس کی حقیقت سما سکتی، تو زمانے سے فارغ دل اور عالَم عقبیٰ کے طلب گار لوگ اپنے دورِ حیات میں عشق کے معنیٰ کے جسم سے فارغ نہ ہوتے اور عشق کے جمال و حسن سے محروم نہ ہوتے اور حجاب میں نہ ہوتے۔

تشریح:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک موقع پر ارشاد فرمایا ہے:

با مدعی مگوید اسرار عشق و مستی

یعنی جو شخص انکار کر رہا ہو، اس کے سامنے عشق و مستی کے اسرار بیان نہ کرو۔ اس کے لئے یہی سزا کافی ہے کہ وہ ان سے محروم ہے۔ واقعتاً یہ معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کہ اگر کوئی شخص انکار کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ ان سے محروم ہوتا ہے۔ دیکھیں! ہمارے جو بڑے ہیں، مثال کے

طور پر صحابہ کرام؛ ان کے عشق کا کیا کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟ اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ ہم لوگ بعض چیزوں کا ادراک نہیں کر سکتے۔ ہمارے حضرت مولانا اشرف صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری مثال مرغابی کے بچوں کی طرح ہے کہ جیسے مرغابی کو پانی میں ڈبکی دی جاتی ہے، پھر جب وہ باہر آتی ہے، تو خشک ہی خشک ہوتی ہے۔ ہم صحابہ کے واقعات پڑھتے ہیں، لیکن ان میں سے چیزوں کو نہیں پا سکتے، حالاں کہ صحابہ کا عشق کمال تھا۔ سبحان اللہ!

ایک دفعہ بعض مجاہدین کی ایک جماعت میں سے ایک ساتھی نے مجھے بتایا کہ ہم میں سے بعض ساتھیوں کو یہ خیال ہو گیا کہ شاید ہمارے اوپر جتنے مصائب، تکالیف اور مجاہدات آئے ہیں، شاید ان کی وجہ سے ہم نے صحابہ کے level (سطح) کو چھو لیا ہے۔ ایسا وہم ہو جاتا ہے، یہ خیال غلط تھا۔ لیکن غلط خیال بھی تو انسان کے ذہن میں آ سکتا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہمارے ذہن میں جب یہ بات آئی، تو ایک ساتھی نے خواب دیکھا، خواب میں دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ جیپ میں تشریف فرما ہیں۔ دوسرے بعض حضرات بھی اس میں موجود ہیں اور جیپ پہاڑ کے اوپر چڑھ رہی ہے۔ اچانک جیپ پیچھے ہونا شروع ہو جاتی ہے، تو اس کو روکنے کے لئے ہم لوگوں نے چھلانگ لگائی اور پتھروں کو ڈھونڈنا شروع کر دیا تاکہ جیپ کے ٹائروں کے نیچے رکھ دیں، جیسا کہ ایسے موقع پر گاڑی کو روکنے کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ جب ہمارا ساتھی پتھر لے کے آیا، تو دیکھا کہ صحابہ نے اپنے سر ٹائروں کے نیچے رکھے ہوئے تھے، ان کے سروں سے خون بہہ رہا تھا۔ کہنے لگے کہ جب ہم جاگ گئے، تو اس ساتھی نے کہا: ”اف ہو، اس خواب سے تو ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ تم کہاں اور صحابہ کہاں؟“۔

صحیح بات یہ ہے کہ ہماری صرف باتیں ہیں اور باتوں سے تو صرف باتیں بنتی ہیں، لیکن ان کے پکے حالات تھے۔ آپ ﷺ نے جب چندے کے لئے فرمایا، تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا کیا؟ عمر رضی اللہ عنہ کی ابو بکر رضی اللہ عنہ سے مسابقت تو چلتی رہتی تھی۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سوچنے لگے کہ شاید آج میں کچھ اچھے حال میں ہوں۔ اس لئے آج میں ان سے جیت جاؤں گا۔ نصف مال اٹھا کر لے گئے، نصف اپنے گھر کے لئے چھوڑ دیا۔ وہ نصف بہت زیادہ تھا۔ جب نصف لے کر گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: اپنے گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا ہے؟ انہوں نے کہا: نصف یہاں لایا ہوں اور نصف چھوڑ دیا ہے۔ فرمایا: ٹھیک ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا۔ پھر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے۔ تو آپ ﷺ نے ان سے بھی پوچھا کہ اپنے گھر والوں کے لئے کیا چھوڑا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ گھر والوں کے لئے اللہ اور اللہ کے رسول کا نام کافی ہے، گھر والوں کے لئے وہی چھوڑ کر آیا ہوں۔ گھر میں جھاڑو دے کر اپنا سارا مال آپ کی خدمت میں لے آیا ہوں۔ اب یہ کیا چیز ہے؟ آدمی ذرا غور تو کرے! حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کسی نے کہا کہ حضرت! آپ لشکر کے اندر مطمئن ہو کر گھس جاتے ہیں۔ آپ کو یہ خوف نہیں ہوتا کہ کسی وقت تلوار آپ کے اوپر چل سکتی ہے نیزہ آپ کے اوپر آسکتا ہے یا تیر آپ کے اوپر آسکتا ہے؟ فرمایا: کیوں نہیں، یہ خوف تو ہوتا ہے، لیکن مجھے یہ بھی پتا ہے کہ جو تلوار میرے لئے بنی ہو گی، وہ کسی دوسرے پر نہیں چلے گی، جو تیر میرے لئے بنا ہو گا، وہ کسی دوسرے کو نہیں لگے گا اور جو نیزہ میرے لئے بنا ہو گا، وہ کسی دوسرے کے جسم پر نہیں چلے گا۔ یہ اصل میں بڑی بات ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کو نقل فرمایا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ اگر

آپ کو اختیار دیا جاتا کہ آپ بچپن میں فوت ہو کر محفوظ طریقے سے جنت میں چلے جائیں (کیوں کہ مسلمانوں کے بچے تو جنتی ہوتے ہیں، اس میں تو کوئی شک ہی نہیں) یا پھر جوانی میں امتحان میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو گرفتار کروادیں تو آپ کون سی بات اختیار کرتے؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: میں دوسری بات اختیار کرتا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسا عشق کی وجہ سے کہا ہے۔

بلکہ اللہ پاک نے انسان کے بارے میں فرمایا ہے کہ میں نے جو چیز پہاڑوں کے اوپر پیش کی تھی اور پہاڑوں نے اسے قبول کرنے سے معذرت کر دی تھی، وہ چیز جس وقت میں نے انسان پر پیش کی تو اس نے اسے قبول کر لیا، کیوں کہ انسان ظَلُوْمًا جَهُوْلًا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بڑی زبردست تشریح فرمائی ہے۔ دیکھیں! الفاظ کو ذرا غور سے دیکھیں، ظَلُوْمًا جَهُوْلًا، ان کی تشریح صرف عشق سے ہی ہو سکتی ہے، اور کوئی اس کی تشریح نہیں ہو سکتی۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہ فرمایا کہ یہ انسان کے اندر جو پنہاں عشق تھا، اس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ اور شیطان کے بارے میں حضرت رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ چار عین (ع) ہیں، شیطان کے پاس تین عین تھے، چوتھا نہیں تھا۔ وہ عارف بھی تھا، عابد بھی تھا، عالم بھی تھا، لیکن عاشق نہیں تھا۔ اگر یہ عاشق ہوتا، تو کبھی بھی یہ غلطی نہ کرتا۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مجھ سے بعض لوگوں کو عقیدت ہے اور بعض کو محبت ہے، فرمایا کہ عقیدت بھی بڑی چیز ہے، لیکن مجھے محبت پسند ہے، کیوں کہ محبت کے اندر پھر کوئی اشکال نہیں ہوتا۔ محبت ایسی عجیب چیز ہے، جو محبوب کے عیوب کو بھی پسندیدہ بنا دیتی ہے، چہ جائے کہ جو حسن ہو، تو اس کے ساتھ کیا ہی معاملہ ہو گا!

ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تو حسن ہی ہے۔ کوئی دوسری صورت ہے ہی نہیں۔ وہ سُبْحَانَ ہے، پاک ہے۔ اور جس کو اللہ کے ساتھ عشق ہو گا، اس کی کیا بات ہو گی؟ اسی وجہ سے یہ عشق محفوظ ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

یہ کیا چیز ہے؟ میرا تو خیال ہے کہ عشق اور عقل کو سمجھنے کے لئے غزل ہی مناسب ہے۔ کیوں کہ بعض چیزوں کی تشریح کلام سے ہوتی ہے۔

غزل:

عقل والوں کی رسائی ذہن میں رکھتے ہوئے، عشق والوں کی رسائی پہ کوئی بات کرے

حسن والوں کی چاہتوں کو سامنے رکھ کر، خرد کی اپنی سست روی پہ کوئی بات کرے

حسن والے تو اتنا چاہیں اتنا عقل تو ہو، ساتھ یہ ہو تو وہ پہچانے تو سب میں جائیں

یعنی حسن والے چاہتے کہ اتنی عقل تو ضرور ہونی چاہئے کہ وہ پہچان لئے جائیں۔ مثال کے طور پر کوئی بہت حسن والا ہے، لیکن اِس میں اتنی عقل ہی نہیں ہے کہ یہ اس کو سمجھ سکے۔ اس لئے اتنی عقل تو ضروری ہے کہ کم از کم اس حسین کو سمجھ تو سکیں اور اس کی صفات کو پہچان لیں۔

حسن والے تو اتنا چاہیں اتنا عقل تو ہو، ساتھ یہ ہو تو وہ پہچانے تو سب میں جائیں

باقی پہچان کے بعد عشق سے ممکن جو ہے، اس کی فطری وارفتگی پہ کوئی بات کرے

لیکن اگر پہچان لئے جائیں، تو اس کے بعد عقل کام نہیں کرتی۔ عقل فیل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد عشق کی وابستگی ہے، وہ اصل کام کرتی ہے۔ جتنے واقعات حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے، حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور اسی طرح ہمارے اور اکابر مثلاً: صدیق مرغشی رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں، وہ سب ہماری عقل سے بالا ہیں۔ وہاں پر عقل کام نہیں کر سکتی۔ ان کو سمجھنے کے لئے عقل فیل ہو جاتی ہے۔

عقل جب عقل ہو تو عقل کو سیدھا رکھے، عشق جب عشق ہو تو ہو اصلی معشوق کے ساتھ

عقل تو وہ ہے، جو صحیح جگہ پر پہنچائے یعنی عقل صحیح استعمال ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ عقل کو صحیح استعمال کرنے کی عقل۔ اور وہ عقل تب حاصل ہو گی جب موجودہ عقل کو صحیح استعمال کیا جائے۔ گویا کہ عقل کا جو tool (آلہ) ہے، وہ کیسے استعمال کیا جائے؟ اس کا راستہ وہ عقل بتائے گی، جو اس کی inputs (یعنی اپنی معلومات) سے بھی بالا ہو گی، کیوں کہ موجودہ عقل نفسانی عقل ہے، جو ہماری آنکھوں، ذہن، زبان، کان وغیرہ ان چیزوں کی حسّوں کے ساتھ متعلق ہے اور ہم نفسانی طور پر جن چیزوں سے متاثر ہوتے ہیں، یہ عقل ان چیزوں کو حاصل کرنے کے بارے میں بات کرے گی۔ لیکن جو عقلِ ایمانی ہے یعنی ایمان کے ذریعے سے جو چیزیں معلوم ہوں، جو عقل ان کا ادراک کر رہی ہو، تو وہ عقلِ ایمانی ہے۔ وہ پھر عقل کو صحیح استعمال کرنے کے لئے بتائے گی۔

دوسری طرف عشق ہوس بھی ہو سکتا ہے، ہوس تو عشق نہیں ہے۔ ہوس کو عشق کا نام دیا گیا ہے۔ اصل عشق وہ ہے، جو اصل معشوق کے ساتھ ہو۔ یعنی دنیا کے ساتھ جو ہم برت

رہے ہیں، وہ صرف اس کے لئے برت رہے ہیں جو ہمارا اصل معشوق ہے یعنی اللہ کے لئے کر رہے ہیں۔ اگر بیوی کے ساتھ بھی محبت ہو، تو اللہ کے لئے ہو، استاد کے ساتھ بھی محبت ہو، تو اللہ کے لئے ہو، اگر والد کے ساتھ بھی محبت ہو، تو اللہ کے لئے ہو، اولاد کے ساتھ بھی محبت ہو تو اللہ کے لئے ہو۔ ایسی صورت میں اگر کوئی بیوی، کوئی والد، کوئی بیٹا، کوئی بھائی یا کوئی بہن اس محبت کے درمیان حائل ہونا چاہے گا، تو وہ اس کو خاطر میں نہیں لائے گا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک مرتبہ لڑائی میں اپنے بیٹے کی زد میں آ گئے تھے، جب کہ ان کے وہ بیٹے کافر تھے۔ پھر جب بعد میں ان کے بیٹے مسلمان ہو گئے تو بیٹے نے کہا: ابا جان! فلاں موقع پر کئی دفعہ آپ میری تلوار کی زد میں آئے تھے، لیکن میں نے سوچا کہ میرے والد ہیں، اس لئے میں نے تلوار پیچھے کر لی۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اگر تم میری تلوار کے نیچے آتے تو میں ہر گز اپنی تلوار کو پیچھے نہ کرتا۔ اب یہ ایسی چیز ہے کہ گویا تمام چیزوں کے ساتھ ہماری محبت؛ اس اصلی محبت کے لئے ہو۔ اس لئے اگر عشق، صحیح عشق ہو، تو وہ اس اصلی معشوق کے ساتھ ہو۔

عقل جب عقل ہو تو عقل کو سیدھا رکھے، عشق جب عشق ہو تو ہو اصلی معشوق کے ساتھ
عقل جب نفس سے آلودہ ہو تو دل کی پھر، ہے جو ممکن اس میں کجی پہ کوئی بات کرے

یعنی اگر عقل نفس سے آلودہ ہے تو دل میں کجی آئے گی، کیوں کہ یہی عقل نفس سے بھی حصہ لیتی ہے، اگر عقل ایمان سے حصہ لیتی ہے، تو نفس سے بھی حصہ لیتی ہے، مشاہدہ سے بھی لیتی ہے اور ایمان بالغیب سے بھی حصہ لیتی ہے۔ اب اگر عقل نفس سے آلودہ ہو گی، تو پھر

دل کے اندر کجی آئے گی، کیوں کہ یہی نفس دل کو بھی متاثر کرے گا۔ اس لئے اس پر کوئی بات ہونی چاہئے۔ اور وہ یہ کہ

﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ (آل عمران: 8)

ترجمہ: "اے ہمارے رب! تو نے ہمیں جو ہدایت عطا فرمائی ہے، اس کے بعد ہمارے دلوں میں ٹیڑھ پیدا نہ ہونے دے اور خاص اپنے پاس سے ہمیں رحمت عطا فرما۔ بیشک تیری، اور صرف تیری ذات وہ ہے جو بے انتہا بخشش کی خوگر ہے"۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق، عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

کہتا اقبال ہے درست پر یہ عشق ملے کیسے؟ اس کے ملنے کی آگہی پہ کوئی بات کرے

یہ علامہ اقبال رحمہ اللہ کے ایک تاریخی شعر کے بارے میں بات ہے اور وہ تاریخی شعر یہ ہے:

عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

دراصل اس شعر میں علامہ اقبال نے ایک target (ہدف) بتایا ہے یعنی یہ بتایا ہے کہ یہ حالت ٹھیک ہے اور یہ حالت غلط ہے، یہ ہونا چاہئے اور یہ نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن صحیح کو حاصل کیسے کریں؟ یہ نہیں بتایا۔ یہ تو کوئی بتائے گا تو پھر پتا چلے گا۔ باقی عشق کے بارے میں علامہ اقبال جو بتا رہا ہے، وہ صحیح بات ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

لیکن اس عشق کو کیسے حاصل کریں؟ اس کے بارے میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا ہے۔ اس بارے میں پھر ان کو دیکھنا پڑے گا، مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھنا پڑے گا، مطلب یہ ہے کہ یہ چیز وہاں سے ملے گی، یہاں سے نہیں ملے گی۔

عقل بن جائے اگر عشقِ حقیقی کا غلام، وہ خواہشاتِ نفسانی کا کرے ٹینٹوا بند
اس کی تائید ہو معشوقِ حقیقی سے پھر، دل کی الہامِ رحمانی پہ کوئی بات کرے

یعنی ہماری عقل اگر عشقِ حقیقی کی غلام بن جائے، تو پھر وہ نفسانی خواہشات کا ٹیٹوا بند کر دے گی، ان کو اٹھنے ہی نہیں دے گی۔ اور پھر اس کے بعد جو جواب ملے گا، اللہ تعالیٰ سے جو الہامِ ربانی آئے گا، اس کی بھی بات ہونی چاہئے۔

ایسا عاشق جب پہنچے اپنے معشوق کے ہاں، اور وہ معشوق ہو باوفا کا بنانے والا
ساتھ وہ معشوق ہو قادر کہ کرے جو بھی کرے، شبیر اس کی مہمانی پہ کوئی بات کرے

یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ پر فدا ہیں۔ جب وہ اپنے معشوق کے پاس پہنچیں گے تو وہ ان کی کتنی قدر کرے گا۔ جنہوں نے اپنی جان قربان کی، اپنی خواہشات کو قربان کیا، اپنا نام قربان کیا۔ اور پھر جو قدر دان ہے، وہ بھی ایسا ہے کہ سارے قدر دانوں کی قدر کرنے والا ہے، باوفا ایسا ہے کہ سارے باوفاؤں کو پیدا کرنے والا ہے، تو اس کا اپنے عاشقوں کے ساتھ کیا ہی معاملہ ہو گا! پھر

معشوق کی طرف سے جو مہمانی ہو گی، کوئی شخص اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا، کیوں کہ وہ تمام کاموں پر قدرت والا ہے، جو چاہے، کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے یہ بہت ہی زیادہ نفع کا سودا ہے۔

متن:

ابیات:

اے عشق تو دریغا کہ بیان از تو خجال ست
حظ تو ز خود باش و حظ تو محال است
اُنس تو برباد است با زلف سیاہ است
قوتت ز خدا ہست حیات تو زخال است

ترجمہ: "افسوس کہ تیری محبت اور عشق کا حال بیان کرنا باعثِ خجالت ہے۔ (یعنی بیان نہیں کیا جاسکتا۔) تُو خود ہی اپنے آپ مقدر بنو اور تمہارا خود اپنے آپ مقدر بننا ناممکن ہے، تمہارے ساتھ محبت کرنا اور تمہارے کالے گیسو کی محبت لاحاصل ہے، آپ کی روزی اور خوراک تو خدا کی جانب سے ہے اور تمہاری زندگی کفن سے ہے"۔

یعنی موت کے بعد حیاتِ سرمدی حاصل کرو گے۔ حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس مقام یعنی ﴿فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی﴾ (النجم: 10) کی تشریح کی ہے اور انہوں نے فرمایا ہے کہ: **"اِتْمَامُ الْعُبُوْدِیَّۃِ لِلْعَبْدِ اَنْ یَّکُوْنَ عِشْقُہٗ کَعِشْقِ اللّٰہِ تَعَالٰی"** یعنی عبودیت کی انتہا اور تکمیل یہ ہے کہ بندہ کی محبت اللہ تعالیٰ کے عشق کی مانند ہو جائے، عبودیت کی انتہا، تکمیل اور اتمام یہی ہے کہ تقصیر اور توقیر ختم ہو کر رہے۔ یعنی کمی بیشی کا

حساب نہ رہے۔ میں نے یہ بات اشارے، رمز و کنایہ کے طور پر کہی، ورنہ حقیقت اور اس راز کو واضح طور پر یوں کہہ سکتے ہیں کہ جو مالک و معبود کے لئے حاصل ہے، وہی بندہ کو بھی حاصل ہو اور جو صفات مالک کی ہوں، مثلاً ہنسنا، دیکھنا، قدرت، ارادت، زندگی، بقااور کلام و دوام؛ وہی بندہ کو بھی مالک کی صفات کی وجہ سے حاصل ہوں۔ اے عزیز بھائی! ذرا دیکھئے! شیخ ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ اس مقام میں فرماتے ہیں کہ: **"فَقَالَ: أَنَا أَقَلُّ مِنْ رَبِّيْ بِسَنَتَيْنِ"** میں اپنے رب سے دو سال کمتر ہوں۔ یعنی وہ مجھ سے دو سال کی سبقت رکھتا ہے اور میں اُس سے دو سال کم ہوں اور یہ ایام اللہ تھے، یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے سال ہوتے ہیں۔ اور اے بھائی! اللہ کے سال میں ہر دن ہزار سال کے برابر ہوتا ہے **﴿وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ (الحج: 47)** "اور بے شک تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک روز تمہارے حساب کے روز سے ہزار برس کے برابر ہے"۔ اے برادر! شیخ محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نا سمجھ علماء سمجھتے ہیں کہ ایسا کہنا کفر ہے۔ میں اس کی تشریح کروں گا کہ یہ ایک حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: **"كُنْتُ كَنْزًا مَّخْفِيًّا، فَأَحْبَبْتُ أَنْ أُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ لِأُعْرَفَ" (الأسرار المرفوعۃ فی الأخبار الموضوعۃ، رقم الحدیث: 253)**

ترجمہ: "میں ایک پوشیدہ خزانہ اور گنجینۂ مستور تھا، میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، پس میں نے مخلوق پیدا کی تاکہ پہچانا جاؤں"۔

پس اے بھائی! اُس مخفی کا ظہور **"فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ"** یعنی تخلیقِ روح تک کا زمانہ سات لاکھ بیس ہزار سال (720,000 سات لاکھ بیس ہزار سال) تھا، پس اللہ تعالیٰ کے دو سال

سات لاکھ بیس ہزار سال تھے۔ پس اللہ تعالیٰ کے اس اظہار کے بعد کہ میں خلق کی تخلیق کرنا چاہتا ہوں، روح کی تخلیق دو سال بعد ہوئی، اس کے بعد دوسری مخلوق پیدا ہوئی، اللہ کریم کی ابتدائی حالت جس کو وہ "**كَنْزًا مَّخْفِيًّا**" یعنی گنجینۂ مستور سے مثال فرماتا ہے، ان دو سالوں سے قطعِ نظر اس حالت یعنی کنزِ مخفی کی ابتدا ہی نہیں۔ پس حضرت شیخ ابو الحسن خرقانی رحمۃ اللہ کی بات صحیح ہے کہ وہ مجھ سے دو سال سبقت رکھتے ہیں۔ اب اگر علماء اس بات کو نہ سمجھیں تو کیا کہا جا سکتا ہے۔

جناب حسین منصور (حلاج) اور ابو بکر دقاق فرماتے ہیں اور یہی بات حضرت جنید بغدادی بھی فرماتے ہیں، کہ "**اَلْفَقِيْرُ هُوَ الَّذِيْ لَا يَفْتَقِرُ إِلٰى نَفْسِهٖ وَلَا إِلٰى رَبِّهٖ**" یعنی فقیر وہ ہوتا ہے جو نہ تو اپنی ذات کا محتاج ہوتا ہے اور نہ اپنے پروردگار کا، کیوں کہ احتیاج اور حاجت مندی کمزوری اور نقص ہے اور فقیر جب اُس کمال کو پہنچتا ہے، تو وہ اُس مقام تک رسائی حاصل کرتا ہے کہ "**إِذَا تَمَّ الْفَقْرُ فَهُوَ اللّٰهُ وَتَخَلَّقُوْا بِأَخْلَاقِ اللّٰهِ**"

"جب فقر درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے، تو یہی خدا کا مقام ہے اور اللہ تعالیٰ کے اخلاق اختیار کرو"۔

عاشق کا اس سے بلند تر مقام اور کوئی نہیں۔ یا اللہ کریم! ہمارا یہی مقصود ہمیں نصیب فرما۔

اے عزیز بھائی! حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کو احسن القصص (بہترین قصہ) کہا گیا ہے۔ اس کا سبب بس یہی ہے کہ ﴿**يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ**﴾ (**المائدۃ: 54**) کی نشانی اپنے میں

رکھتا ہے۔ اے بھائی! ﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ﴾ (المائدۃ: 54) کی خبر تجھے اُس وقت ہو جائے گی کہ تجھے اس آیت مبارک کے معنیٰ نظر میں جلوہ افروزی کریں: ﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ أَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِإِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ﴾ (الشوریٰ: 51)

تشریح:

اصل میں وہی بات ہے کہ رمز کی باتیں انسان زیادہ نہیں کھول سکتا، جب تک ان کو وہ چیزیں حاصل نہ ہو جائیں جو ان کے سامنے کھولنے کے لئے ہوتی ہیں۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے روح کے بارے میں جو کلام فرمایا ہے، اگر کوئی اسے پڑھ لے یا سن لے تو میرے خیال میں بہت ساری چیزیں اس راستہ کی clear (واضح) ہو جائیں گی، کیوں کہ حضرت نے فرمایا ہے اور حدیث شریف بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز میں نہیں سما سکتا، مگر مومن کا قلب، کہ اس میں سما سکتا ہے۔ اب مومن کا قلب کہاں اور اللہ جل شانہ کہاں! یہ کیا بات ہے؟ یہ تصور میں بھی نہیں آ سکتا، لیکن جیسے اللہ پاک ہیں، اسی طرح روح بھی سمجھ میں نہیں آ سکتی، کیوں کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے: میں نے اس کا علم بہت کم کسی کو دیا ہے۔ روح کی dimensions (طول و عرض) نہیں ہیں اور روح جب پیدا ہو گئی تو اب ہمیشہ کے لئے رہے گی یعنی روح ختم نہیں ہو گی، جسم ختم ہو جاتا ہے، لیکن روح ختم نہیں ہوتی، روح باقی رہے گی۔ ہاں یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ کسی روح کو جنت میں بھیج دیا جائے گا اور کسی روح کو دوزخ میں بھیج دیا جائے گا، لیکن بہر حال روح باقی رہے گی۔

اب یہ جو اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ ''میں پوشیدہ خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، تو میں نے اپنی مخلوق کو پیدا کیا'' یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اپنے ارادے سے اپنی معرفت کے لئے پیدا کیا ہے تاکہ مخلوق اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے۔ پھر اللہ جل شانہ نے اس روح کو جو لافانی چیزیں عطا فرمادیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے سے عطا فرمائی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ روح جسم میں آکر اپنے رب کو بھول جائے تو پھر یاد دہانی کے لئے اس کو کچھ کرنا پڑتا ہے۔ پھر اس کو ذکر، مجاہدات اور ریاضتوں کے ذریعے سے یاد دہانی کرائی جاتی ہے۔ مجاہدات اور ریاضت سے اور کچھ نہیں ہوتا، صرف نفس کے چھلکے اترتے ہیں۔ نفس نے روح کو جکڑا ہوتا ہے تو نفس کے چھلکے اتارے جاتے ہیں۔ ذکر اللہ سے روح کو اس کا سبق یاد دلایا جاتا ہے، مطلب یہ کہ روح کو پہلے سے پتا ہوتا ہے کہ میں کیا ہوں اور کس کے لئے ہوں؟ ذکر اللہ سے انسان کو اللہ یاد آتے ہیں، روح کو اللہ یاد آتا ہے اور جو ہم نفس کے خلاف مجاہدات اور ریاضتیں کرتے ہیں، ان سے نفس کی جو رکاوٹیں ہیں اور نفس نے ہمارے تمام حصوں کو جو جکڑا ہوتا ہے یعنی دل کو بھی جکڑا ہوتا ہے، ان مجاہدات اور ریاضتوں کی وجہ سے نفس کی گرفت کمزور ہوتی جاتی ہے۔

اب نفس کی گرفت کو کمزور کر لو اور اس کے ساتھ ساتھ دل کی آنکھیں کھولو۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی نے دل کی آنکھیں کھولیں اور اپنے نفس کے خلاف مجاہدہ نہیں کیا، نفس کو مجاہدے کے ذریعے سے روح سے نہیں ہٹایا تو ایسی صورت میں وہ پھر نفس کی خواہشات کو پائے گا اور پہلے سے زیادہ محسوس کرے گا، کیوں کہ نفس کا غلام ہو گا، اس لئے زیادہ محسوس کرے گا۔ ایسی صورت میں پھر اس کو مجاہدہ کروانا پڑے گا۔

اس مجاہدہ کے ذریعے سے نفس کے اثرات ختم کرنے پڑیں گے۔ پھر جب وہ نیچے آئے گا، تو اسی کو ''نزول'' کہتے ہیں۔ مثلاً: انسان کے اندر ایک ترفّع پایا جائے، مثلاً: میں مراقبات کر رہا ہوں اور میرے مراقبات بڑے شان دار ہیں، یہ نظر آ رہا ہے اور یہ نظر آ رہا ہے، ٹھیک ہے کہ سب مشاہدات نظر آ گئے، لیکن اس کا مطلب کیا ہو گا؟ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ میں بڑا ہوں! اگر یہ بات پیدا ہو گئی، تو مجھے بتاؤ کہ کیا حاصل ہوا؟ کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ اس لئے مجاہدہ کے ذریعے سے ''میں بڑا ہوں'' کو ختم کرنا ہے۔ اسی کو ''نزول'' کہتے ہیں۔ چنانچہ مجاہدہ کے ذریعے سے اس کو دوبارہ زمین پر لایا جاتا ہے۔ نفس کی طرف سے روح کو جکڑنے کا جو نظام ہے کہ نفس نے روح کو جکڑا ہوا ہے اور یہ دونوں قلب میں موجود ہیں۔ حضرت نے اس کی تشریح فرمائی ہے کہ قلب میں نفس اور روح دونوں آپس میں باہم گتھم گتھا ہیں۔ اب مجاہدات کے ذریعے سے ان کو چھڑانا ہے۔ جب یہ آپس میں ایک دوسرے سے چھوٹ جائیں گے، تو روح اوپر اور نفس نیچے آ جائے گا، نفس اپنے مقام پر آ جائے گا اور روح اپنے مقام پر چلی جائے گی۔ پھر جب روح اپنے مقام پر چلی جائے گی تو نفس کا اس کے اوپر اثر نہیں ہو گا، جس کی وجہ سے روح اللہ کے ساتھ واصل ہو جائے گی۔ پھر روح کی تشکیل کر کے واپس بھیج دیا جاتا ہے، اس کو ''منتہی مرجوع'' کہتے ہیں۔ روح جب دوبارہ واپس آتی ہے، تو نفس پر حاکم ہو کر آتی ہے، محکوم ہو کر نہیں آتی۔ اب وہ نفس کی تمام چیزوں کو جانتی ہے کہ اس کے کیا کیا اثرات ہیں۔ ان اثرات کو جاننے کی وجہ سے پھر انسان باقی لوگوں کی تربیت کر سکتا ہے، کیوں کہ اگر وہ جانتا نہ ہو، تو کسی کی تربیت کیسے کرے گا؟ اس لئے روح دوبارہ واپس آ جاتی ہیں، لیکن حاکمانہ طور پر۔ اس وقت روح پر نفس کی جکڑ نہیں ہوتی، البتہ نفس کی حِسّیں موجود ہوتی ہیں، بلکہ پہلے سے زیادہ ہوتی ہیں، کیوں کہ اس

صورت میں دو کام ہو جاتے ہیں: ایک تو اس کو ان لوگوں کی تمام چیزیں سمجھ آتی ہیں، جن کی وہ تربیت کر رہا ہوتا ہے کہ ان کے کیا احساسات ہیں، کیا مشکلات اور کیا تکالیف ہیں۔ اور دوسرا کام یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو میسج (الہام) آتا ہے، اس کو وہ حاصل کر سکتا ہے اور لوگوں کی تربیت کے لئے اس کو استعمال کر سکتا ہے۔ روح کی تشکیل کے بعد روح جب نفس پر غالب ہو کر آ جاتی ہے، تو اس وقت شیخ برزخ کی مانند بن جاتا ہے یعنی اوپر اللہ تعالیٰ سے لیتا ہے اور نفس کے ذریعے سے لوگوں کو دیتا ہے۔ ان کے حال کے مطابق ان کی تربیت کرتا رہتا ہے۔ اسی لئے حضرت نے فرمایا: جب تک کسی کو یہ مقام حاصل نہ ہو، ان کو اجازت نہیں دینی چاہئے۔ یعنی جو شخص صرف اوپر ہی اوپر ہے، اس کو اجازت نہ دو۔ کیوں کہ وہ تو دعویٰ کی کیفیت میں ہے، وہ ابھی نیچے نہیں آیا، اس کو پہلے دعویٰ سے نیچے لانا ہے، پھر پتا چلے گا۔ اسی وجہ سے اصل میں مجاہدات اور ریاضتوں کی ضرورت ہے، ان کے بغیر انسان کا کام نہیں ہو سکتا۔ اللہ جل شانہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

vvv

توضیح المعارف

(تیسری قسط)

انسانی روح کے کمالات

1. کمالات کے لحاظ سے انسانی روح کی جو درجات (grading) ہیں، اس کو سمجھایا گیا ہے۔

پہلے حصّے میں فرمایا گیا ہے کہ عام طور پر جس چیز کو روح کہا جاتا ہے، اس کے تین اجزاء (components) ہیں: روحِ ملکوتی، نفسِ ناطقہ اور نسمہ۔ روحِ انسانی کے کمالات کے درجات کو سمجھنے کے لئے ان تینوں کی علیحدہ علیحدہ خصوصیات اور ان کے آپس میں تعامل (interaction) کو سمجھنا ضروری ہے۔

2. روح کا مادے یا جسم سے قریبی تعلق نسمہ سے ہے، جو جسم میں غذا سے بنتا ہے۔ اس کے بعد نفس ناطقہ سے ہے، جو مادے سے تعلق بھی رکھتا ہے، اور اس سے پاک بھی ہے۔

جیسے عکس شیشے سے تعلق بھی رکھتا ہے اور اس کی مادیت سے الگ بھی ہے۔ اگر مادیت کو نیچے تصور کیا جائے، تو ان تینوں اجزاء میں روحِ ملکوتی سب سے اوپر ہے۔

3. عالمِ ارواح کی حیثیت عالمِ شہادت (محسوس کائنات) سے پہلے کیسی ہوتی ہے، اس کی کئی مثالیں دی گئی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے:

ایک post (عہدہ) مثلاً: وزیرِ اعظم جب مقرر ہوتا ہے، تو اس کی ساری مراعات، اختیارات، دفتر وغیرہ سب مقرر ہوتے ہیں۔ یہ عہدہ اس وقت مادے سے پاک ہونے کے باوجود ایک قسم کا اپنا وجود رکھتا ہے۔ یہ گویا روح کی مثال ہوئی۔ پھر جب ایک مخصوص شخص اس خالی عہدے پر فائز ہو جاتا ہے، تو وہ عہدہ جو ایک concept (ذہنی تخیل) تھا، اب وہ materialize ہو گیا اور ایک نئی چیز وجود میں آ گئی۔ اس شخص کے لئے وہ عہدہ گویا ایک سانچہ تھا، جس میں وہ ڈھل گیا۔

4. نفسِ ناطقہ دراصل نسمہ کی موجود قوتوں کو استعمال کرنے والا ہے، جس سے خود نسمہ کی تکمیل اور اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ نے روحِ انسانی کی perfection (کمال) کے مختلف درجات (gradings) اور ہر درجہ کے خواص (properties) بیان فرمائے ہیں۔

1. نفسِ ناطقہ کے کمالات کا اظہار نسمہ میں ہوتا ہے۔
2. چوں کہ چیزیں اپنی اضداد (opposites) سے سمجھ آ سکتی ہیں، اس لئے پہلے نقائص کا ذکر کیا۔
3. نقائص کو سمجھانے کے لئے درج ذیل مثال دی گئی ہے۔

سورج کا عکس ایک آئینہ میں پڑ رہا ہے۔ کامل عکس نہ پڑنے کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں:

1. آئینہ کی فطرت (nature) میں irreparable (نا قابلِ ازالہ) خرابی۔
2. آئینہ میں عارضی (repairable) نقص۔
5. آئینہ اور سورج کے درمیان رکاوٹ۔ مثلاً: بادل کا آنا، سورج کی پوزیشن۔
4. اسی طرح نسمہ سے متعلق نقائص یہ ہیں:

1. عارضی نقائص، جن کی اصلاح شیخِ کامل کی تربیت سے ہو سکتی ہے۔
2. جبلتی یا فطری نقائص، جن کا ازالہ ممکن نہیں۔

3. کمال کی راہ میں ایسی رکاوٹ، جن کا ازالہ صرف جذبِ وہبی یا اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہو سکتا ہے۔

5. ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے زیادہ ہم پر مہربان ہیں اور اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کو ضائع نہیں فرماتے، اس لئے ہم اپنی اختیاری کوشش اور محنت میں کمی نہ آنے دیں، لیکن اس میں مبالغہ (یعنی دو انتہاؤں؛ وہم اور لا پرواہی) سے بچیں اور استحقاق کے بغیر اللہ تعالیٰ سے فضل کی امید رکھیں۔

نسمہ میں موجود مختلف صلاحیتیں

یعنی قوتِ محرکہ (motivity)، حسِ مشترک (Common sense)، قوتِ خیال (visualization/perception) قوتِ واہمہ (imagination)، قوتِ عاقلہ (intellect/reason) اور قوتِ عازمہ (Will-power)؛ ان کو define (بیان) کیا گیا ہے۔ پھر بتایا گیا ہے کہ ان سب کا اپنا اپنا ایک خاص مصرف یعنی استعمال کی جگہ ہے، جہاں انہیں استعمال ہونا چاہئے۔

روحِ انسانی کے تیسرے جزو، نسمہ کی جن پانچ بنیادی قوتوں کا تعارف اوپر گذرا، ان میں سے ہر قوت کے استعمال کا اپنا اپنا میدان (domain) ہے۔ انسانی تاریخ کے

تمام ادوار کے تمام عقل مند اس بات پر متفق چلے آ رہے ہیں کہ نسمہ کی قوتوں کی تہذیب یا ان کو organize (منظم) کرنے میں ہی انسان کی اصل کامیابی اور کمال ہے اور یہ تہذیب اور تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے کہ ان میں سے ہر قوت اپنے متعلقہ مصرف (application) میں استعمال ہو۔

نسمہ کی قوتوں کے استعمال کے دو طریقے:

پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ انسان اپنی متفرق ضروریات کے ضمن میں ان قوتوں کا randomly (غیر منظم) استعمال کرتا رہے۔ عام انسانوں کی اکثریت اپنی روز مرہ زندگی میں ان قوتوں کا استعمال اسی طرح کرتی ہے۔

نسمہ کی ان قوتوں کے استعمال کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ انہیں قوتوں میں سے کسی ایک قوت کے استعمال پر اپنی پوری توجہ مبذول (focus) کی جائے۔ دنیاوی لحاظ سے مختلف fields (شعبوں) کے باکمال لوگوں کا طریقہ یہی ہے۔ نسمہ کی اس مخصوص قوت کے لحاظ سے ایسے خاص لوگوں اور عوام میں بے انتہا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ قوتِ عقلیہ کے لحاظ سے عام عوام کا فلاسفہ اور سائنسدانوں سے جو فرق ہے یا قوتِ محرکہ کے لحاظ سے ان کا جمناسٹک اور کھیلوں کی دنیا کے مشاہیر (celebrities) سے جو فرق ہے یا

قوتِ خیال کے لحاظ سے بڑے شاعروں سے جو فرق ہے، یہ سب بنیادی طور پر اس دوسرے طریقے کے اپنانے یا نہ اپنانے کی وجہ سے ہے۔

نوٹ: انہی پانچ اصولی قوتوں کے اپنے اپنے متعلقہ domains (میدانوں) میں استعمال سے قدیم فلاسفہ کے ہاں نسمہ کی تہذیب سے متعلق پانچ فنون وجود میں آئے۔ جس کے لئے قدیم فلاسفہ نے اپنے اپنے دور اور علاقے کے لحاظ سے مختلف اصطلاحات بنائی تھیں، جو کہ ان کی کتابوں میں موجود ہیں۔ گو جدید دور میں علوم وفنون کے پھیلاؤ سے ان علوم کی بہت ساری نئی شاخیں اور تخصصات (specializations) بن گئے ہیں، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے، تو یہ تمام علوم بھی نسمہ کی ان مختلف قوتوں کی کارفرمائیوں کا نتیجہ ہیں۔

نسمہ کی تہذیب کی انسانی کوششوں میں افراط و تفریط کی وجوہات:

نسمہ کی تہذیب کے اس دوسرے طریقے میں، جس کو آج کل کی زبان میں specialization (تخصص) کہہ سکتے ہیں، کچھ خامیاں inbuilt ہیں۔

1. **انسانی کمزوریاں (Limitations):** انسان اپنی صلاحیتوں کے لحاظ سے محدود ہے. وہ تمام چیزوں کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اگر ایک field (شعبہ) میں اس کی دل چسپی

اور انہماک ایک خاص درجے سے بڑھ جائے، تو دوسری fields (شعبوں) کی اہمیت نظر انداز ہونے لگتی ہے. ان سے ناواقفیت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کے بارے میں اس کی رائے میں غلطیوں کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے فلسفی اور سائنس دان جو دماغی کاموں میں مشغول رہتے ہیں، اپنی روز مرہ زندگی کے کاموں میں غائب دماغی کی وجہ سے ان سے مضحکہ خیز حرکات سرزد ہوتی رہتی ہیں۔

2. **بڑائی اور تکبر:** قوتِ عقلیہ سے متعلق علوم، مثلاً: ریاضی اور فلسفہ میں انہماک سے انسان کے اندر ایک تعلی (بڑائی) اور دعویٰ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو نسمہ کی دوسری قوتوں سے متعلق علوم کے حاصل کرنے میں یا ان کے بارے میں متوازن اور حقیقت پسندانہ (realistic) رائے قائم کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

نسمہ کی تہذیب کے سلسلے میں شریعت کا کردار:

نسمہ کی سعادت کے حصول کے سلسلے میں انسانی کوششوں میں پائی جانے والی مندرجہ بالا کمزوریوں کا علاج، خالقِ کائنات کی طرف سے انبیائے کرام کے ذریعے بھیجے گئے علوم میں موجود ہے۔ یہ علوم معتدل اور unbiased (افراط و تفریط سے پاک)

ہوتے ہیں اور ان میں نسمہ میں موجود ہر قوت (faculty) کی اصلاح کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ شرعی احکام پر (سمجھ کر یا بلا سمجھے) عمل سے ان قوتوں (قوتِ خیالیہ، عقلیہ، وہمیہ، عازمہ اور محرکہ) پر مثبت اثر پڑتا ہے۔ شریعت مطہرہ پر عمل سے ہی انسان ان میں سے کسی ایک faculty (قوت) میں ایسے غلو سے، جس سے باقی قوتوں میں تعطل پیدا ہو، محفوظ رہ سکتا ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب: دنیا میں رہنے والے اربوں انسانوں میں سے ہر ایک نسمہ کی صلاحیتوں کے لحاظ سے اپنی ایک مخصوص استعداد رکھتا ہے۔ اگر کسی کو اس بات پر شبہ ہو کہ شریعت کے standardized (معیاری) قوانین سے نسمہ کی ان مختلف قوتوں کا حق کیسے ادا ہو سکتا ہے؟ تو وہ شخص اپنے اس شبہ کا علاج انسانی معاشرے میں رائج انسانوں کے ہی بنائے ہوئے قوانین پر غور کرنے سے کر سکتا ہے۔

اگر انسانی معاشرے کا جائزہ لیا جائے، تو معلوم ہو گا کہ پیشوں (professions) اور صلاحیتوں کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف طبقات، مثلاً: ڈاکٹر، انجنیئر، تاجر، مزدور، کسان اور سرکاری ملازم پیشہ وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو دوسرے کی خدمات درکار ہوتی ہیں۔ مثلاً: گھر بنانے کے لئے ڈاکٹر کو سول انجنیئر اور علاج کے لئے انجنیئر کو ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان تمام لوگوں کی مختلف

ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پیسہ (money) کا نظام بنایا گیا ہے، جس سے ان سب کی ضرورتیں ایک دوسرے کے ذریعے پوری ہو جاتی ہیں۔

دوسری آسان مثال ٹریفک کے قوانین کی دی جا سکتی ہے۔ اس قانون کو بنانے والے انسان، انتہائی سوچ بچار کر کے بے شمار مصلحتوں اور possibilities (امکانات) کو پیشِ نظر رکھ کر ایک قانون بناتے ہیں، ایسے قوانین میں پیدل چلنے والوں اور گاڑی والوں، سب کا خیال (built-in) ہوتا ہے۔ اگر انسان اپنی limitations (محدود صلاحیتوں) کے باوجود اپنے قوانین میں ایسا لحاظ رکھ سکتے ہیں، تو خالقِ کائنات سے ایسا کرنے کو کیوں بعید سمجھا جائے!

نسمہ کی پانچ قوتوں، قوتِ عقلیہ، خیالیہ، وہمیہ، عازمہ اور محرکہ کی اصلاح اور ترقی کے لئے انسانی کوششوں اور ان کے نتیجے میں بننے والے علوم کے مختلف شعبوں میں افراط و تفریط کا پیدا ہونا ناگزیر تھا، جس کی وجوہات اوپر بیان کی گئیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے انسانوں کو اس confusion (ذہنی الجھاؤ) سے نکالنے کے لئے انبیائے کرام کی زبانی ان میں سے ہر شعبے کے صحیح اور قطعی اصول بیان فرما دیئے، ان کو "نصوص" کہتے ہیں۔ یہ اصول ان شعبوں کی بنیاد قرار پائے۔ مثلاً: قوتِ عاقلہ کی اصلاح کے لئے صحیح عقائد (توحید، رسالت اور آخرت) بیان فرمائے۔ قوتِ واہمہ کی

اصلاح کے لئے مختلف ذکر واذکار بیان فرمائے۔ قوتِ خیالیہ میں انتشار سے بچنے کے لئے ہدایات دیں۔ مثلاً: بد نظری وغیرہ سے منع فرمایا۔ اسی طرح قوتِ عازمہ، جو قلب سے متعلق ہے اور گویا نسمہ کی قوتوں کی سردار ہے، کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ اچھے اور برے اخلاق کی وضاحت کی۔

خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ راولپنڈی کے شب و روز

الحمدللہ خانقاہ رحمکاریہ امدادیہ میں حضرت شیخ سید شبیر احمد کاکاخیل صاحب دامت برکاتہم کے دروس و خطبات کا سلسلہ نہایت پابندی کے ساتھ جاری و ساری ہے جس سے طالبانِ حق مسلسل سیراب ہو رہے ہیں۔ دروس کی تفصیل درج ذیل ہے:

آج کی بات

روزانہ صبح بعد از نمازِ فجر تین مختصر بیانات ہوتے ہیں

- درسِ قرآن
- ریاض الصالحین سے ایک حدیث شریف کی تعلیم
- مطالعہ سیرت بصورت سوال

جمعۃ المبارک:

- کسی ایک مسجد میں جمعہ کا بیان
- ختم قرآن، مجلس درود شریف اور اس کے بعد جمعہ کی آخری گھڑیوں میں دعا (عصر اور مغرب کے درمیان)

ہفتہ:

- حضرت مولانا اشرف سلیمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **"سلوکِ سلیمانی"** اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **"تربیت السالک"** کا درس (بعد نمازِ مغرب)
- بعد از عصر (ہفتہ) تا اشراق (اتوار) تک مرد حضرات کے لیے خانقاہ میں اصلاحی و تربیتی جوڑ ہوتا ہے جس کے معمولات یہ ہیں: نمازِ عصر کے بعد انفرادی ذکر، نمازِ مغرب اور اوابین کے بعد جوڑ بیان اور مجلس ذکر میں شرکت، نمازِ عشاء کے بعد منزل جدید کی تلاوت، سورہ ملک کی تلاوت، ختمِ خواجگان، مجلسِ درود شریف، حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "**اسوۂ رسولِ اکرم ﷺ**" سے تعلیم، کھانے پینے اور سونے کے آداب و سنن کی تعلیم، کھانا، آرام، نمازِ تہجد اور انفرادی معمولات، ختمِ قرآن اور نمازِ اشراق

اتوار:

- خواتین کے لیے اصلاحی بیان) دن 11 سے 12 بجے تک خانقاہ میں شرعی پردے کے اھتمام کے ساتھ (۔نوٹ: ہر ماہ میں کسی ایک اتوار کو خانقاہ میں صبح 9 سے 12 بجے تک تین گھنٹے کا خواتین کیلئے اصلاحی و تربیتی خصوصی جوڑ ہوتا ہے۔
- فرض عین علم کی تعلیم (بعد نمازِ مغرب)
- انگریزی میں بیان (رات 8 بجے)

پیر:

- پشتو میں بیان (بعد نمازِ عصر)
- اصلاح و تربیت کے متعلق (بذریعہ وٹس ایپ، ای میل اور ٹیلی فون پر موصول ہونے والے) سوالات کے جوابات (بعد نمازِ مغرب)

منگل:

- مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی معرکۃ الآرا کتاب مثنوی شریف کا درس (بعد نمازِ مغرب)

بدھ:

- حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات شریفہ سے درس (بعد نمازِ مغرب)

جمعرات:

- حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب **"سیرت النبی ﷺ"** سے درس (بعد نمازِ مغرب)
- درود شریف کی مجلس (درودِ تنجینا ایک ہزار مرتبہ، اسکے بعد نعت شریف، چہل درود شریف کی سماعت اور مناجاتِ مقبول سے دعا)

بزرگوں کی تحریریں کیوں پڑھنی چاہئیں؟

بزرگوں کی تحریریں اُن کی زندگی کا نچوڑ ہوتی ہیں۔ ہم ہزاروں تجربات کرکے جس چیز تک نہیں پہنچ سکتے ان کی تحریروں سے ہم اُن چیزوں تک آناً فاناً پہنچ سکتے ہیں۔ اس وجہ سے بزرگوں کی ان تحریروں میں ریسرچ کرنا جس سے ہمارا یہ مقصد حاصل ہوتا ہو بہت مفید ہے۔ پھر ان میں مجددین حضرات کا رنگ بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ مجددین حضرات کی تحقیقات عمومی دین کے لئے ہوتی ہیں جو کہ اس وقت کے لوگوں کی سطح کے مطابق پیدا شدہ فروگزاشتوں کو دور کرکے دین کو اصلی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔

اگر صرف ایک آخری مجدد کی اتباع کی جائے تو وہ بھی کافی ہوتی ہے لیکن اگر چند متواتر مجددین کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے حالات کے مطابق مطلوبہ تبدیلی لانے کا فن آشکارہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے بعد اگر کوئی تبدیلی آتی ہے تو اس کے لئے "by the process of extrapolation" حل ڈھونڈنا آسان ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں ہم نے اپنے ان اکابر کے فیوضات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ قلب، عقل اور نفس کی اصلاح کے متعلق راہنمائی میں ایک اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قلبی اعمال بہت اونچے تھے جو کہ قلبی واردات والے حضرات کی راہنمائی کرتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے عقلی اعمال بہت زیادہ اونچے تھے۔ اس وجہ سے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحریرات کا فائدہ اُن لوگوں کو زیادہ ہوتا ہے جن کی عقلیں بہت آگے کا سوچتی ہیں۔ حضرت کاکا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صفائی نفس کے اعمال بہت اعلیٰ تھے اس وجہ سے حضرت کی تعلیمات نفس کی صفائی کے کاموں میں مشعلِ راہ ہیں۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات آج کل کے منطقی موشگافیوں کے جوابات کے لئے ماحول بنانے اور صلاحیت پیدا کرنے کے لئے مفید ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے اکابر کی تعلیمات سے پورا پورا مستفید ہونے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

051 5470582 0332 5289274

sshabirkakakhel@gmail.com,
sshabir@tazkia.org

حضرت شاہ صاحب مدظلہ کو سوالات بھیجنے کیلئے 0315 5195788

www.tazkia.org